مکمل ناول

دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا۔ نل کے پاس برتن دھوتی بڑی آپا نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ور نجف دروازہ کھول کر ادھر ادھر جھانکنے کے بعد دبے پاؤں گھر میں داخل ہوئی تھی۔ شاید دادی یا اماں کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے اس نے یہ احتیاط کی تھی۔

بڑی آپا سے اس کی نظر ملی تو انہوں نے اشارے سے اسے اپنی طرف بلا لیا۔ وہ ننگے پاؤں باہر سے کھیلتی ہوئی آئی تھی۔ اس لیے پاؤں بے تحاشا گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ بال پونی سے نکل کر ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ ننھے منے پھولوں والی گلابی فراک کی حالت بھی بے حد خراب ہو رہی تھی۔ بڑی آپا نے دھوئے ہوئے برتن ایک طرف کیے جھاڑو سے برتنوں کا میل کچیل پرے ہٹایا اور پھر اسے اپنے ساتھ بٹھا کر صابن سے رگڑ رگڑ کر اس کے ہاتھ اور پاؤں دھونے لگیں۔ پھر اس کا منہ دھلوا کر تولیہ اس کے ہاتھوں میں دیا اور چپل پہننے کی تاکید کرتے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

اس نے جھک کر دادی کے تخت کے نیچے سے اپنی چپل نکالی اور پاؤں میں اڑستے ہوئے کچن میں آ گئی جہاں اماں دودھ کا گلاس بھر کے عظیم کے ہاتھ میں تھما رہی تھیں۔ ور نجف کی بھوک ایک دم چمک اٹھی تھی۔

"اماں! مجھے بھی۔" اس نے بڑے ندیدے پن سے عظیم کے ہاتھوں میں پکڑے دودھ کے گلاس کو دیکھا اور پھر پرامید نظروں سے اماں کو دیکھنے لگی۔

"دودھ ختم ہو گیا ہے۔"

"نہیں اماں! ابھی تو جگ میں بہت سا دودھ پڑا ہے۔" اس نے ایڑیاں اٹھا کر اماں کے ہاتھ میں

فاخرہ جبین

ہم جو کھلائے طلوعِ ماہتاب

پکڑے جگ میں جھانکنے کی کوشش کی اور اس کی اس حرکت پر اماں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"یہ تمہارے ابا کے لیے ہے۔"

"اماں! تھوڑا سا۔" اس نے لجاجت سے کہا اور اماں دانت پیس کر رہ گئیں۔

"مجال ہے جو اس لڑکی کو ذرا صبر آجائے۔" اماں عظیم کے ہاتھ سے خالی گلاس لیتے ہوئے بڑبڑائیں تو وہ قدرے سہم کر اماں کے بیزار چہرے کو دیکھنے لگی تھی۔

"یہ لے پکڑ۔" اماں نے گلاس اس کی طرف بڑھایا جس میں آدھے سے بھی کم دودھ ڈالا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ بڑھاتی' عظیم نے اماں کے ہاتھ سے گلاس جھپٹ کر منہ سے لگایا اور غٹاغٹ دودھ چڑھا گیا۔

"اماں!" در نجف چیخی تھی اور اس سے دو سال بڑا عظیم اس کی جھنجلاہٹ پر کھلکھلا کر ہنس دیا تھا۔ در نجف کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پانیوں سے لبالب بھر گئی تھیں۔

"موٹا گندا۔" وہ پاؤں پٹخ کر رہ گئی۔

"اے بھائی کو اس طرح نہیں بولتے۔" اماں نے اسے گھورا۔

"لیکن اماں!" وہ روہانسی ہو گئی کچھ بولا ہی نہ گیا تو وہیں فرش پہ بیٹھ کر بے آواز رونے لگی۔

"ہو ہو' در نجف رو رہی ہے' بے چاری ذرا شکل تو دکھاؤ اپنی۔" عظیم قہقہے لگاتا اس کی پونی کھینچنے لگا۔

"دفع ہو جاؤ تم۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"وہ بے چاری کو دودھ ہی نہیں ملا' مانو بلی اسی لیے رو رہی ہے نا؟"

عظیم جان بوجھ کر اسے تنگ کر رہا تھا' کچھ تو بھوک کی شدت نے اسے چڑا دیا تھا۔ اس پر عظیم کی بدتمیزی' اس نے سلگتے ہوئے عظیم کا ہاتھ اپنی پونی پر سے جھٹکا۔ کس قدر برا لگ رہا تھا وہ اس وقت در نجف کو' اس نے منہ بسورتے ہوئے شکایتی نظروں سے اماں کو دیکھا مگر وہ بے نیازی سے چولہے میں لکڑیاں سلگا رہی تھیں۔ تب ہی عظیم نے ایک بار پھر اس کی پونی زوردار طریقے سے کھینچی تو وہ ایک دم چیخ اٹھی۔

"عظیم موٹو' اللہ کرے مر جاؤ تم۔" فوری طور پر اس کے منہ میں جو بھی آیا وہ کہہ گئی تھی اور اماں کی بے نیازی یک لخت ہی ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے دہل کر اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا اور وہیں سے ایک لکڑی اسے کھینچ ماری۔

"اے تیرے منہ میں خاک' کلموہی خدا تجھے غارت کرے۔" دادی اپنی تخت پہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں اور اسے کوسنے دینے لگیں۔ دونوں طرف کے تابڑ توڑ حملوں نے اسے اچانک ہی خوفزدہ کر دیا تھا۔

"اماں! وہ بھی تو۔" اس نے کپکپاتے ہونٹوں سے کچھ کہنا چاہا مگر اماں کے چہرے پہ چھائی سرخی اور آنکھوں میں لہراتے غصے نے اس کی زبان بند کروا دی تھی۔ دوسری طرف دادی کی صلواتیں ابھی تک جاری تھیں۔

"زبان کٹ جائے اس منحوس کی' ارے میرا اکلوتا پوتا منتوں مرادوں والا' وہ بھی اس کو کھٹکتا ہے۔ آمیرا چاند میری آنکھوں کی ٹھنڈک' ادھر میرے پاس آکر بیٹھ' میں کوئی دم درود کروں تجھ پر خدا تجھے نظر بد سے بچائے۔"

دادی عظیم کو آغوش میں لیے چٹاچٹ اسے پیار کرنے لگی تھیں۔ در نجف باورچی خانے کے دروازے سے لپٹی سہمی سہمی آنکھوں سے دادی کو دیکھتی رہی۔ جن کے چہرے پہ محبت و شفقت کے ہزار رنگ بکھرے ہوئے تھے' صرف اور صرف عظیم کے لیے۔

"اب یہاں کھڑی دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہے چل دفعان ہو یہاں سے۔"

دادی نے عینک کے موٹے عدسوں کے پیچھے سے اسے گھورا تو وہ سست روی سے چلتی ہوئی اسٹور میں آ گئی۔ یہاں ایک چارپائی پہ بستروں کا انبار لگا ہوا تھا۔

بستروں کے اوپر چڑھ کر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں واضح تھیں۔ سامنے دیوار پر نظریں گاڑے وہ بے ترتیب اور بے ربط خیالات میں الجھی رہی' پھر رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

شام رات کی تاریکی میں ڈھلنے لگی تھی' جب بڑی آپا اسے ڈھونڈتی ہوئی اسٹور میں چلی آئیں۔ اس کی ایک ٹانگ اور بازو بستروں کے ڈھیر سے نیچے لٹک رہے تھے۔ اگر وہ ذرا سی بھی حرکت کرتی تو یقیناً نیچے جا گرتی۔ بڑی آپا نے اسے نزدیک جا کر سیدھا کیا۔ اس کی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ گالوں پر آنسوؤں کے مٹے مٹے سے نشان تھے اور گلابی ہونٹ نیم وا۔ انہیں اس کی بھرپور معصومیت پر ٹوٹ کر پیار آیا تو بے اختیار ہی جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ ذرا سا کسمسائی تو بڑی آپا نے آوازیں دیتے ہوئے اسے جگا دیا۔

"نجف! کھانا کھا لو بعد میں سو جانا۔"

وہ چند لمحے اپنی خوابیدہ آنکھیں ان کے چہرے پہ جمائے لیٹی رہی' پھر ان کے اصرار پر سستی سے اٹھ کر ان کے ساتھ ہی باہر آ گئی۔ کلی کر کے کچن میں آئی تو سب لوگ چولہے کے گرد نیم دائرے میں بیٹھے تھے۔ جب تک اماں نے سالن ڈال کر اس کے آگے رکھا۔ مینا آپی اور نیہا کھانا کھا کر اٹھ گئی تھیں۔ اس نے روٹی ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنی رکابی سے نظر ہٹا کر برابر بیٹھے عظیم کی طرف دیکھا۔ تو اس کی رکابی میں بھنا ہوا مسالے دار گوشت دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر ایک نظر اپنی رکابی پہ ڈالی' جس میں سرخ سرخ شوربے میں دو چار آلو تیر رہے تھے۔

"اماں! مجھے دوسرا سالن دے دو۔" اس نے منہ بناتے ہوئے رکابی پرے کھسکا دی۔

"دوسرا کون سا؟"

"یہ ہی جو عظیم کھا رہا ہے۔" اس کی نشاندہی پر اماں خوامخواہ ہی چولہے میں لکڑیاں درست کرنے لگی تھیں۔

"اماں!" اس کے دوبارہ پکارنے پر وہ جھنجلا کر اس کی طرف پلٹیں۔

"نجف! خاموشی سے کھانا کھا لے۔" ان کے چہرے پہ وہی تناؤ اور سختی در آئی تھی' جس سے اسے ہمیشہ ہی خوف آتا تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکا کر پتلے شوربے میں روٹی ڈبونے لگی' نظریں ایک بار پھر غیر ارادی طور پر عظیم کی رکابی تک ہو آئی تھیں۔

تب ہی عظیم کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی تو اس نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا اور پھر جیسے آنکھیں میچ کر بڑے بڑے نوالے حلق سے نیچے اتارے اور اٹھ کر باورچی خانے سے باہر آ گئی۔

بڑی آپا بستر بچھا کر لیٹ چکی تھیں۔ وہ بھی ان کے برابر جا لیٹی تو بڑی آپا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"بڑی آپا۔" اس نے کسی گہری سوچ میں گم ہو کر انہیں پکار اٹھا۔

"عظیم اچھا بچہ ہے؟"

"ہاں۔"

"اور میں آپا میں گندی بچی ہوں؟" اس نے کروٹ بدل کر آپا کو دیکھا۔

"نہیں تم بہت اچھی بچی ہو لیکن کیوں پوچھ رہی ہو یہ سب؟" انہوں نے الجھتے ہوئے اس کی پرسوچ آنکھوں میں جھانکا۔

"اس لیے آپا! کہ اماں عظیم کو ہر روز دودھ دیتی ہیں مجھے نہیں دیتیں۔ عظیم نے آج گوشت سے روٹی کھائی اور میں نے آلو سے۔"

"چندا! گوشت تھوڑا تھا نا اپا' عظیم اور دادی کے لیے ہی پکا تھا۔ ہم سب ہی نے آلو اور شوربے سے ہی روٹی کھائی ہے۔"

"اسی طرح ہمارے لیے دودھ نہیں بچتا۔ بس عظیم اور ابا کے لیے ہوتا ہے۔ آپا! ہم صرف اس وقت ہی کھا سکتے ہیں جب کوئی چیز بچ جائے۔ لیکن آپا! اگر کوئی

چیز نہ بچے تو پھر یعنی۔"

در نجف آپا کو سمجھا نہ پا رہی تھی کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہی ہے اور کیا کہنا چاہتی ہے۔ لیکن آپا نا سمجھ نہیں تھیں۔ جان گئی تھیں کہ اس کے ساتھ ہونے والی حق تلفی نے آج پہلی بار اس کے شعور پر دستک دی ہے۔

محرومی کے اذیت ناک اژدہے نے پہلی بار اس کے دل میں ڈنک اتارا ہے۔ وہی اژدھا جو پچھلے بیس سال سے ان کے دل میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا اور وقت بے وقت ان کی رگوں میں زہر پھیلاتا رہتا تھا۔

"تو ابھی بہت چھوٹی ہے نجف! بہت معصوم ایسی باتیں نہ سوچا کر چل میں تجھے ایک کہانی سناتی ہوں۔" انہوں نے اسے تھپکتے ہوئے کہا اور خود سے کہانی گھڑ کے سنانے لگیں۔

رنگوں، خوشبوؤں، تتلیوں اور پریوں کی کہانی جسے سناتے سناتے بڑی آپا سپنوں کے دیس میں کھو گئی تھیں اور جسے سنتے سنتے در نجف نیند کی وادیوں میں کھو گئی تھی۔ جہاں پھلوں کے باغات تھے گوشت کے انبار تھے، دودھ کی نہریں تھیں اور جہاں وہ اکیلی تھی۔ نہ عظیم کی طنزیہ، تمسخرانہ مسکراہٹ تھی نہ دادی کی گالیاں اور کوسنے بس وہ تنہا تھی اور جی بھر کے ان نعمتوں کے مزے لوٹ رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

در نجف صحن کی بائیں دیوار کے ساتھ بنی کیاری کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے اور وہ کیاری سے مٹی نکال نکال کر اسے دونوں ہاتھوں سے گوندھتی جا رہی تھی۔ اس کے آس پاس کتنی ہی مٹی بکھری ہوئی تھی۔ گدلے پانی سے بھرا ڈبہ بھی نزدیک ہی پڑا تھا۔ بڑی آپا نے کچن سے نکلتے ہوئے اس کی خستہ حالت دیکھ کر اسے نہانے کے لیے کہنا چاہا مگر وہ اتنے پر سکون اور مطمئن انداز میں کھیل رہی تھی کہ پھر انہوں نے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور دال سے بھرا تھال لے کر برآمدے میں مونڈھے پر بیٹھ کر دال صاف کرنے لگیں۔

وہ بہت محنت اور احتیاط سے مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتن بنا رہی تھی۔ ایک بار بالوں کی لہراتی لٹ اس کے ہونٹوں سے لپٹ گئی تھی جسے ہٹاتے ہوئے اس نے بے خبری میں اپنے منہ اور بالوں پر بھی مٹی لگالی تھی۔ مٹی کا چولہا، بنڑیا، توا، چھوٹی چھوٹی ٹیڑھی میڑھی چیزوں کا ایک ڈھیر لگا لیا تھا اس نے اپنے پاس۔

"اور یہ روٹی ابا کے لیے۔" اس نے مٹی کی روٹی بنا کر توے پہ ڈالی تب ہی بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا تھا۔ نجف نے گردن گھما کر دیکھا ابا اپنی سائیکل سمیت گھر میں داخل ہو رہے تھے اور وہ نجانے کس خیال کے تحت بھاگ کر ابا کے پاس آئی تھی اور ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ باپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی یہ معصوم سی کوشش بالکل غیر ارادی تھی۔

"اوہو ہٹو پیچھے، ہاتھ دیکھے ہیں تم نے اپنے۔" ابا نے اس کا مٹی سے لتھڑا ہوا ننھا سا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا تھا۔

"گھر میں داخل ہوتے ہی منحوس صورتیں سامنے آکھڑی ہوتی ہیں۔"

انہوں نے بازو سے پکڑ کر اسے ایک طرف دھکیلا تو وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ مٹی سے بنے ہوئے برتن اس کے گھٹنوں اور ہاتھوں کے زور سے چور چور ہو گئے تھے اس کی بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں آنسو بہت جلد چلے آتے تھے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ابا صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ چکے تھے۔ گذا سا عظیم ان کی گود میں چڑھا بیٹھا تھا اور ابا شاپر میں سے سیب نکال کر دیتے ہوئے اس کے پھولے پھولے گالوں پر پیار کر رہے تھے۔ در نجف کو اس لمحے ابا اور عظیم دونوں ہی بہت برے لگے تھے۔

"ابا نے مجھے پیار نہیں کیا، عظیم کو کیا ہے، مجھے سیب نہیں دیا عظیم نے پورا شاپر لیا ہے میں بھی ابا کو روٹی نہیں دوں گی۔ آج بھوکے رہیں گے وہ۔"

اس نے مٹی کی روٹی کو اپنے ہاتھوں سے مسل دیا۔

ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو پھسل کر اس کے گالوں پر چلے آئے۔ ہونٹ نکال کر بے آواز روتے ہوئے اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرنا چاہے تو مٹی کے کتنے ہی ذرات آنکھوں میں گھس گئے۔

"ہائے۔" وہ ایک دم تڑپی اور پھر زور زور سے رونے لگی۔ کچن کی طرف جاتی بڑی آپا نے اس کے رونے کی آواز سنی تو لپک کر اس کی طرف آگئیں۔

"کیا ہوا ہے؟ ارے ہاتھ تو ہٹاؤ۔" انہوں نے زبردستی اس کے ہاتھ پیچھے ہٹائے جن سے وہ اپنی آنکھوں کو مزید مسلتی جا رہی تھی۔

"آنکھوں میں مٹی پڑ گئی ہو گی۔ چلو شاباش میں منہ دھلوا دیتی ہوں۔"

آپا نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا مگر اس کے رونے میں کمی کی بجائے شدت آگئی تھی۔ عموماً وہ بہت گھٹ گھٹ کر رویا کرتی تھی۔ آج اس طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے کی وجہ سے آپا گھبرا گئی تھیں۔ اسے گھسیٹ کر نل کی طرف لے جاتے ہوئے انہوں نے کن اکھیوں سے باپ کی طرف دیکھا تھا جس شخص کو گھر میں بیٹیوں کی ہنسی کی آواز ناگوار گزرتی ہو وہ ان کا رونا چلانا بھلا کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن در نجف تو شاید لاشعوری طور پر باپ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہ رہی تھی۔ دل میں یہ خواہش مچل رہی تھی کہ ابا اسے اپنی گود میں بٹھائیں اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بڑی محبت سے پوچھیں کہ وہ کیوں رو رہی تھی۔

لیکن ایسا ہوا نہیں تھا اس کے برعکس ابا دھاڑے تھے۔

"کیا مصیبت آ پڑی ہے اس چھٹنکی پر۔ گھر میں آؤ تو بندہ دو گھڑی سکون کو ترس جاتا ہے، ہر وقت کا شور، ہر وقت کی ریں ریں میری تو زندگی جہنم بنا دی ہے ان بدذاتوں نے۔"

ابا بولنے میں بالکل اپنی ماں پر گئے تھے ایک بار بولنے پہ آتے تو بولتے چلے جاتے۔ تاوقتیکہ ان کے دل کی بھڑاس نہ نکل جاتی۔

دادی کا کرتا سیتے ہوئے اماں نے ایک بے تاثر سی نگاہ پہلے ابا پر ڈالی اور پھر بڑی آپا کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"مینا! چپ کراؤ اسے۔ کیوں آسمان سر پہ اٹھا رکھا ہے۔"

آپا اتنی دیر میں پانی کے چلو بھر بھر کے اس کی آنکھوں میں ڈالتی رہیں۔ ابا کی بڑبڑاہٹوں کے بعد اماں کی سرد سی آواز کانوں میں پڑی تو اس کی ہچکیاں خود بخود سسکیوں میں ڈھل گئیں۔

آپا نے اس کا منہ، ہاتھ تولیے سے رگڑ رگڑ کر صاف کیے اور پھر اسے اماں کے پاس بٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ وہ یونہی ٹانگیں جھلاتے ہوئے بھیگی پلکوں

سوہنی ہیئر آئل
سوہنی اُبٹن
(ہمراہ بیوٹی پاؤڈر)
قیمت 45 روپے

کے ساتھ ابا اور عظیم کو دیکھتی رہی۔ ابا سیب کاٹ کر چھیل کر عظیم کے ہاتھ میں دیتے جا رہے تھے اور وہ مزے سے کھاتا جا رہا تھا۔ پاس بیٹھی دادی بھی موج میں تھیں۔ تب ہی صدف کمرے سے باہر آئی تھی اور چپکے سے ابا کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔ چند لمحے ندیدے پن سے انہیں دیکھنے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ چھلکوں والی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی اور چھلکے منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔ پھر در نجف کی طرف دیکھ مسکراتے ہوئے اسے اپنے پاس بلانے لگی مگر اس نے صدف کی طرف سے رخ موڑ لیا تھا۔

"آئے ہائے کیا دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہو' بھائی کے کھانے کو نظر لگاؤ گی کیا؟" دادی کی کڑک دار آواز پر اس نے دیکھا دادی صدف کو بری طرح جھڑک رہی تھیں۔

"یہ لے پکڑ اپنی ماں کے پاس لے جا۔" ابا نے ایک سیب اس کے ہاتھ میں تھما کر حقارت سے کہا تھا اور صدف خوشی خوشی سیب ہاتھ میں لیے اماں کے پاس بھاگی چلی آئی تھی۔ اماں نے اس کے کئی حصے کیے تھے اور پھر ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"مجھے نہیں کھانا۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" اماں نے حیرت سے اس کا بجھا بجھا چہرہ دیکھا۔

"پہلے کیوں نہیں دیا ابا نے اور عظیم کو تو اتنے سارے سیب دیے ہیں۔ میں اتنا سا کیوں لوں؟"

"زیادہ نخرے نہیں کرتے یہ لے پکڑ کھانا ہے تو کھا نہیں تو جا میری بلا سے جہنم میں۔"

انہوں نے سیب اس کی گود میں پھینکا اور خود دوبارہ مشین پر جھک گئیں۔ مشین پہلے سے دوگنی رفتار پر چلنے لگی تھی۔ نجف نے سیب کا ٹکڑا اٹھا کر صدف کے ہاتھ میں تھمایا اور خود آپا کے پاس باورچی خانے میں آ گئی اور پھر اسے قدرے گم صم دیکھ کر آپا نے ادھر ادھر کی باتوں میں الجھا لیا تھا تاکہ اس کا ذہن غیر ضروری باتوں کے منفی اثرات سے محفوظ رہ سکے۔

♥ ♡ ♡ ♥

رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا' جب بڑی آپا کی آنکھ کھلی انہوں نے سر اٹھا کر مندی مندی آنکھوں سے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر چونک گئیں۔ کمرے کی لائٹ ابھی بھی جل رہی تھی حالانکہ سونے سے پہلے انہوں نے نیناں کو تاکید کی تھی کہ خیال سے ساری بتیاں بجھا دے مگر نیناں نے حسب عادت ان کی بات پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔ انہوں نے خود سے لپٹی ہوئی در نجف کو آہستگی سے علیحدہ کیا اور چارپائی سے نیچے اتر آئیں۔ کمرے کی بتی بجھا کر دروازہ بند کرنے کے بعد انہوں نے پانی پیا تھا اور جب دوبارہ بستر پر آئیں تو نیند ان کی آنکھوں سے یکسر غائب ہو چکی تھی۔ چند لمحے کروٹیں بدلنے کے بعد وہ یونہی در نجف کی طرف کروٹ بدل کر غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

شکل و صورت کے لحاظ سے وہ اتنی پیاری بچی نہیں تھی کہ اسے دیکھتے ہی اس پر ٹوٹ کر پیار آ جائے۔ کھلتی ہوئی رنگت تھی جاذب نظر نقوش' بڑی بڑی آنکھیں جو اس کی معصوم چہرے پر اس لیے نمایاں لگتی تھیں کہ ان میں ہمہ وقت سوچ کا تاثر موجود رہتا تھا۔ اس کی حد درجہ حساس اور زود رنج طبیعت نے اس کے چہرے پر تفکر کی ہلکی سی پرچھائیں ثبت کر دی تھی۔ وہ بچوں کے درمیان بیٹھتی تھی تو اسے دیکھ کر انسان ایک لمحے کے لیے چونکتا ضرور تھا۔

اور بڑی آپا کو لگتا تھا کہ وہ انہی کا پرتو ہے۔ انہی کی طرح سوچتی ہے۔ ان ہی کی طرح محسوس کرتی ہے اور شاید اسی لیے وہ اسے سب بہنوں سے زیادہ عزیز تھی تھیں۔

عظیم کی پیدائش کے بعد اماں کو اتنا وقت ہی کب ملتا تھا کہ وہ بیٹے کو چھوڑ کر کسی بیٹی پر توجہ دے سکتیں۔ سو اس نے بخوشی اس ننھی گڑیا کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ ایک ماں کی طرح پرورش کر رہی تھیں وہ اس کی اور اب تو انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ شاید اسی لیے وہ اس کی طرف سے فکر مند بھی رہنے لگی تھیں۔

انہیں معلوم تھا کہ در نجف جو سوچ رہی ہے وہ غلط

نہیں لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ جو غلط ہے وہ اسے درست نہیں کر سکے گی۔

لڑکیوں سے نفرت کا جو رویہ برسہا برس سے اس گھر میں پنپ رہا ہے۔ اسے محبت میں بدل دینا اب نا ممکنات میں سے ہے۔ وہ اس گھر میں سب سے بڑی تھیں۔

لڑکی کی پیدائش پر اس نے اس گھر کے در و دیوار پر سناٹا اترتے دیکھا تھا۔

ابا کی امید کو ناامیدی کے غیظ و غضب میں ڈھلتے دیکھا تھا۔

اور اس پر دادی کا واویلا۔

"مجھے تو لگتا ہے پوتے کی حسرت دل میں لیے اس دنیا سے گزر جاؤں گی۔ نسل تو چلتی ہی بیٹوں سے ہے اور مجھے لگتا ہے یہ کلموہی ہمارے خاندان کا نام مٹا کر نہ چھوڑے گی۔ لائن لگا دی ہے نحوستوں کی۔"

وہ اپنے آپ میں سمٹ جاتیں۔ اماں خود کو قصور وار سمجھتے ہوئے تکیے میں منہ کھسا دیتیں۔ بیٹیوں کی اور لڑکے کی پیدائش نے انہیں بیٹیوں سے متنفر کر دیا تھا کہ یہ بری صورت بچیاں ان کے لیے طعنہ بن گئی تھیں۔ ان کی بربادی کا سامان کر رہی تھیں۔

سب سے بڑی خود بینا آپا ہی تھیں۔ ان کے بعد مینا آپی اور اس سے چھوٹی نیناں پھر صبیحہ جو ابنارمل تھی اور جسے پانچ چھ سال کی عمر میں ابا داتا دربار چھوڑ آئے تھے۔ پھر صدف۔ جس کے قدم اس گھر میں مبارک ہی ثابت ہوئے تھے۔

سال بھر کے بعد عظیم پیدا ہوا تھا اور انہوں نے ہر چہرے پر خوشی کا وہ رنگ دیکھا تھا کہ جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

گھی کے چراغ جلائے گئے تھے۔ محلے بھر میں لڈو بانٹے۔ اماں کی میز پر پھلوں کا ڈھیر لگ گیا۔ وہ اترائی اترائی سی کسی راجہ جانی کی ملکہ بنی بیٹھی تھیں۔ پانچ بیٹیاں انہیں وہ عزت و احترام نہ دلا سکی تھیں جو ایک بیٹے نے اس دنیا میں قدم رکھتے ہی دلا دیا تھا۔ بڑی آپا اس پیارے سے گڈے کو دیکھتی رہیں۔ وہ خوش تھیں

مگر انہیں رونا بھی آ رہا تھا وہ اندر ہی اندر گھلتی رہیں۔ عظیم کے بعد در نجف پیدا ہوئی تھی اور اس کا اس دنیا میں آنا ایسا ہی تھا جیسے بادام کھاتے ہوئے اچانک منہ میں کڑوا بادام آ جائے اور ساری کڑواہٹ منہ میں گھل جائے۔ وہ سب سے بڑھ کر ماں باپ کی بے اعتنائی کا شکار ہوئی تھی۔

اور اس بات کو وہ پوری طرح محسوس بھی کر رہی تھی۔

"بارش فصل کے کسی ایک حصے پر ہی برستی رہے تو باقی کی کھیتیاں سوکھ جاتی ہیں۔"

اور بڑی آپا کو لگ رہا تھا کہ یہ ہری بھری کھیتی بھی قدم بہ قدم خزاں کی طرف بڑھتی جا رہی ہے اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ در نجف ہو بہو ان جیسی بن جائے۔

کہ ان جیسے لوگ نیناں اور مینا کی طرح خوابوں کے محل تعمیر نہیں کر سکتے وہ اپنی ذات کے گنبد میں سمٹ جاتے ہیں۔ جہاں نہ روشنی کی کرن آتی ہے نہ اندر کے اندھیروں کو باہر جانے کا راستہ سجھائی دیتا ہے۔

ایسے لوگ صدف کی طرح بے نیاز بھی نہیں ہو سکتے کہ لاپروائی سے بڑی سے بڑی بات چٹکیوں میں اڑا دیں۔ وہ دوسروں کے گھروں میں جا کر بھاگ بھاگ کر جھاڑو پوچا لگائیں اور بدلے میں اچھا کھانا کھا کر نہال ہو جائیں۔ ان جیسے لوگوں کو تو اندر ہی اندر کڑھنا ہوتا ہے۔ امتیازی رویوں کی آگ میں جلنا ہوتا ہے اپنے آپ کو کھوجنا اور پھر خود کو کہیں نہ پا کر اپنی ہی ذات کے اندر مر جانا ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کو دفنانے کے لیے منوں مٹی کی ضرورت تھوڑی ہوتی ہے۔ یہ تو آپوں آپ دفن ہو جاتے ہیں۔

لاحاصل خواہشوں کے ڈھیر میں
بے تعبیر خوابوں تلے
زہریلے رویوں کی راکھ میں

"لیکن میں در نجف کو بینا نہیں بننے دوں گی۔" انہوں نے طویل سانس لیتے ہوئے سوچا۔

اسے اپنے آپ میں مرنا نہیں زندہ رہنا ہے، خود کو تلاشنا ہے۔ میں نہیں اسے اسکول میں داخل کرواؤں گی کتابوں میں نت نئی باتیں پڑھنے کو ملیں گی تو ادھر ادھر کی پریشان کن سوچوں میں الجھنے سے بچی رہے گی۔ میں کل ہی استانی جی کی طرف جاؤں گی۔

انہوں نے دل ہی دل میں تہیہ کرتے ہوئے نجف کی پیشانی پر پیار کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگیں ان کا دایاں بازو ہمیشہ کی طرح در نجف کے غافل وجود کے گرد حمائل ہو گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

صبح بڑی آپا نے اماں سے بات کی تو انہوں نے ہاں میں جواب دیا نہ انکار کیا۔ وہ کچھ لمحے ان کے جواب کی منتظر رہیں اور پھر ان کی طویل خاموشی سے اکتا کر اٹھ گئیں۔ چادر لپیٹی اور نجف کی انگلی تھام کر استانی جی کے گھر چلی گئیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے درمیان بڑی آپا نے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے سارا کام اپنے ذمے لے لیا۔

"تم بس اسے تیار کر کے بھجوا دینا باقی سارا کام میں کر لوں گی۔"

بڑی آپا مطمئن ہو کر واپس آ گئیں اور یوں چند دن بعد ہی اس نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا اور حسب توقع وہ کافی مصروف رہنے لگی تھی۔ پڑھائی میں غیر معمولی دلچسپی کی بنا پر وہ جلد ہی اپنی اساتذہ کی نظروں میں دل پسند طالبہ کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

ہر سال کلاس میں نمایاں پوزیشن لے کر وہ اگلی کلاس میں ترقی کرتی چلی گئی۔ اس روز اسکول سے واپس آئی تو بیگ رکھتے ہی اماں کے سر ہو گئی۔

"اماں! صبح فیس لے کر جانی ہے۔ ٹیچر کہہ رہی تھیں اب فیس جمع نہ کروائی تو اسکول سے میرا نام کٹ جائے گا۔" وہ کافی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

"اماں! سنتی ہو۔ میں کیا کہہ رہی ہوں۔" اس نے اماں کو جوں کی توں اپنے کام میں مصروف دیکھا تو چڑ گئی۔

"کیا مصیبت پڑ گئی تجھے...؟" اماں پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولیں تو وہ روہانسی ہو گئی۔

"اماں! میرا نام کٹ جائے گا اسکول سے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"پیسے دے دو نا میں فیس جمع کروا سکوں۔"

"نہیں ہیں میرے پاس پیسے۔" اماں کا روکھا پھیکا قطعی انداز آنسو ہمیشہ کی طرح آنکھوں میں بھاگے چلے آئے تھے۔

"تو کہاں سے آئیں گے۔" وہ بڑبڑائی۔

"اپنے باپ سے پوچھ جا کر چند سو روپے لا کر میری ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔ سارا مہینہ جس طرح گزرتا ہے تو میں ہی جانتی ہوں۔ خود تو عیش میں رہتا ہے اور مصیبتیں ساری مجھ اکیلی جان پر۔" اور اس سے آگے بڑبڑاہٹوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو سلائی مشین کی گھڑگھڑاہٹ میں کہیں دم توڑ گیا تھا۔ وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگائے ٹپاٹپ آنسو گراتی رہی۔

تب ہی بیرونی دروازہ کھول کر عظیم چلا آیا تخت پر سے کپڑے ایک طرف ہٹا کر بیٹھتے ہوئے اس نے روتی ہوئی نجف کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

"اماں! مجھے کچھ روپے چاہئیں۔" عجیب لٹھ مار سا انداز تھا اس کا، جوں جوں وہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ توں توں تحکمانہ جارحیت اس کی شخصیت کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔

"کیا کرنے ہیں...؟" اماں مشین روک کر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ضرورت ہے۔"

"پھر بھی..." اماں نے استفسار کرنا چاہا مگر وہ تیوریاں چڑھا کر درمیان میں ہی ٹوک گیا۔

"ایک تو تم پولیس والوں کی طرح تفتیش کرنے بیٹھ جاتی ہو اماں! پیسے دینے ہیں تو دو ورنہ میں ابا سے مانگ لوں گا۔"

جواباً اماں نے چپ چاپ مشین اٹھا کر اس کے نیچے سے چند روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے تھے۔

"اتنے پیسوں سے کام نہیں چلے گا، کم قیمت کا بیٹ بھی خریدنا ہو تو ستر اسی روپے لگ ہی جاتے ہیں۔ گیند ساتھ خریدنی ہو تو اس کے پیسے الگ۔" اس نے روپے موڑ تروڑ کر واپس اماں کی گود میں پھینک دیے تھے۔

"ارے جیلا! آخر ایک دفعہ ہی پیسے کیوں نہیں دے دیتیں اس بے چارے کو بھی اس کے باپ کی کمائی ہے۔ وہ خرچ نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا۔ آخر میرا بیٹا کما کس کے لیے ہے۔"

دادی چارپائی پہ بیٹھے بیٹھے چلائیں تو اماں نے چپ چاپ دوبارہ مشین اٹھائی اور سرخ نوٹ نکال کر عظیم کے ہاتھوں میں دے دیے اور وہ نجف جسے پورا یقین تھا کہ عظیم کو بھی اسی کی طرح انکار کا سامنا کرنا پڑے گا ہکا بکا سی رہ گئی تھی۔ آنسوؤں کے اس پار سارا منظر دھندلا سا لگ رہا تھا۔ اس نے فوراً قمیص کے دامن سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"شاید میں ٹھیک سے دیکھ نہیں پائی۔" اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دوبارہ دیکھا۔ عظیم کے چہرے پہ چمکتی جاندار سی مسکراہٹ اور اس کی بند مٹھی سے جھلکتی کرارے نوٹ کی سرخی اسے سن کر گئی تھی۔ اس نے بڑی بے یقینی سے اماں کو دیکھا جو بڑے آرام سے ایک بار پھر مشین چلا رہی تھیں۔

"کیا عظیم کا کھیل میری پڑھائی سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

سوچ کے ساحل پر کئی لہریں ایک ساتھ سر پٹخنے لگی تھیں۔ اسے دادی پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا اور اس سے بھی زیادہ اماں پر وہ دھپ دھپ کرتی کمرے میں چلی گئی۔ شام تک ناراضی کے اظہار کے طور پر اس نے یونیفارم نہیں بدلا تھا۔ رات کو بھوک کے باوجود اس نے کھانا نہیں کھایا اور یونہی سو گئی۔ صبح اٹھی تو اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ آج اسکول نہیں جائے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فیس جمع نہ کروانے پر اسے ہم جماعتوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔

وہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر الجھے بکھرے بال لیے ادھر سے ادھر گھوم رہی تھی جب بڑی آپا نے اسے کمرے میں بلایا۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور قدرے سرخ بھی۔ انہوں نے ایک چادر تہہ کر کے شاپر میں ڈالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"خالہ سکینہ کے گھر لے جاؤ۔ ان سے کہنا پیسوں کی اشد ضرورت ہے ابھی دیں، پھر ان میں سے فیس نکال کر سیدھی استانی جی کو دے آنا اور سنو اماں کو ہرگز مت بتانا کہ پیسے مل گئے تھے سمجھ گئیں نا؟" آپا پوچھ رہی تھیں اور وہ چپ چاپ ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ رات جتنی بار بھی اس کی آنکھ کھلی تھی اس نے آپا کو اس چادر پر جھکے پایا تھا۔

"تو کیا آپا ساری رات جاگ کر کڑھائی کرتی رہیں صرف میرے لیے۔" اس کا دل احسان مندی کے جذبات سے بھر گیا۔

"اب کھڑی کیا سوچ رہی ہو جاؤ نا۔"

آپا نے اسے شانے سے پکڑ کر ہلایا تو وہ چونک گئی اور پھر سر ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ حسب ہدایت وہ استانی جی کو فیس دے کر واپس آئی تو سب لوگ ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ مینا آپی جھاڑو لگا رہی تھیں۔ نیہا برتن دھو رہی تھی اور ساتھ ساتھ صدف کو بھی کوس رہی تھی جو موقع پاتے ہی گھر سے نکل گئی تھی۔

وہ سیدھی بڑی آپا کے پاس پہنچی تھی جو میلے کپڑے دھونے کے لیے نکال رہی تھیں۔ اس نے باقی پیسے چپکے سے ان کے ہاتھ میں دے دیے۔

"آپا! تم مجھے بھی کڑھائی کرنا سکھا دو۔"

"کیوں؟" آپا اس کی غیر متوقع فرمائش پر قدرے حیران ہوتے ہوئے پوچھنے لگی تھیں۔

"مجھے کڑھائی کرنی آ جائے گی تو میں اپنی فیس کے پیسے خود ہی جمع کر لوں گی۔ تمہیں رات رات بھر جاگنا نہیں پڑے گا۔" آپا اس کی سوچ کی رسائی پر متعجب ہو گئی تھیں۔

"نہیں چندا! ابھی تو تمہیں صرف پڑھائی کرنی ہے۔ جب تک تمہاری آپا ہے نا، تب تک تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سمجھیں؟" انہوں

نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ نہال ہوتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اور پھر واقعی جب تک بڑی آپا موجود تھیں، تب تک اسے بھی فیس کے لیے پریشان نہیں ہونا پڑا تھا یہاں تک کہ وہ پانچویں کلاس میں آ گئی تھی۔ لیکن پھر یہ سہارا بھی عارضی ثابت ہوا تھا اور اس کا احساس اسے اس وقت ہوا جب ایک روز اسکول سے واپسی پر صدف نے بڑے پرجوش انداز میں اسے اطلاع دی تھی۔

"بڑی آپا کی شادی ہونے والی ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" وہ حیرت سے چیخی تھی۔

"کب۔۔۔؟"

"اگلے جمعے کو۔"

"اتنی جلدی۔۔۔؟"

"نہیں یقین آتا تو اماں سے پوچھ لو۔۔۔" صدف کو اس کی بے اعتباری ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ وہ فوراً باہر نکل آئی۔ اس بات کی تصدیق کے لیے وہ اماں کے پاس آئی تو محلے کی ایک عورت پہلے سے ان سے باتوں میں مصروف تھی۔

"ارے ایسی سگھڑ، سلیقہ مند ہے اپنی بینا کہ مثال نہیں۔ شکل و صورت کی بھی اچھی خاصی پھر ایسے بے جوڑ رشتے کا کیا جواز؟ اسے تو کوئی بھی بھلا سا گھرانہ اپنی بہو بنا لیتا۔ میں تو سچ کہتی ہوں آپ لوگ بڑی ہی جلد بازی کر رہے ہیں۔" وہ عورت تاسف بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ارے ہم کیا جانیں اس کے باپ نے رشتہ طے کر دیا ہم نے منظور کر لیا۔ اب جو اس کے نصیب۔" دادی نے بات کو ٹالنا چاہا۔

"ارے بوا! آپ نے مجھ سے کہہ دیا ہوتا۔ کچھ وقت تو لگتا مگر ایسا رشتہ ڈھونڈ کر لاتی کہ۔۔۔"

"دیکھو جی بات صرف اتنی سی ہے کہ ایک بینا ہی تو نہیں پیچھے بھی پوری لائن لگی ہوئی ہے۔ ایک کو بھگتاؤ تو دوسری تیار۔ ایسے ہی شہزادوں، رئیسوں کے انتظار میں رہے تو پانچوں کی پانچوں بیٹھی رہیں گی ساری عمر اپنے باوا کی دہلیز پر۔۔۔" دادی اماں نے اکتائے ہوئے کوفت بھرے انداز میں بات کی جبکہ اماں چپ سادھے بیٹھی تھیں۔

"پھر بھی خالہ! آخر کیا دیکھ لیا آپ نے الیاس احمد میں؟ میں نے تو سنا ہے خیر سے پہلے بھی بیوی بچوں والا ہے۔" عورت کے متجسسانہ انداز پر دادی نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہاں ہے اس کی بیوی۔ مگر مفلوج۔ اپنے میکے میں ہی رہتی ہے۔ تین چھوٹے بچوں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں اسی لیے دوسری شادی کر رہا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اپنے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق ہے اس کا کہ ہماری بینا عیش کرے گی عیش۔"

"اور وہ پچیس ہزار روپے کا کیا معاملہ ہے؟"

"ارے معاملہ کیا ہوتا ہے بھلا آدمی ہے۔ جانتا ہے بچی والوں پر کتنا بوجھ ہوتا ہے شادی پر خرچے ورچے کے لیے ہی دے گا۔" دادی کے صاف صاف بتا دینے پر وہ عورت سر جھٹک کر رہ گئی تھی۔

"اس سے تو اچھا تھا کسی قلی مزدور سے بیاہ دیتے۔ بھلے دو وقت کی روٹی مشکل سے ملتی پر شوہر تو اس کا اپنا ہوتا۔ وہ تین بچوں کا باپ اور خاندانی بیوی کا شوہر۔ کیا دے پائے گا اپنی بینا کو، میں تو سچی بات کہوں گی۔ کسی کو برا لگتا ہے تو لگے۔ منیر بھائی نے بیٹیوں کو گائے بھینس سمجھ رکھا ہے۔ جس نے خواہش کی اسی کے کھونٹے سے باندھ دیا۔ خدا ان بچیوں کے حال پر رحم فرمائے۔"

وہ عورت اپنی بات کہہ کر چلی پھر یہ جا وہ جا پیچھے دادی کسمسا کر رہ گئیں۔ ور نجف بھی ان کی بڑبڑاہٹوں سے تنگ آ کر وہاں سے اٹھ گئی اور آپا کی تلاش میں باورچی خانے میں آ گئی۔ وہ سر جھکائے چولہے کی راکھ کرید رہی تھیں۔ نجف ان کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ بڑی آپا معمول سے زیادہ خاموش لگ رہی تھیں اس نے کئی بار ان سے بات کرنے کی کوشش کی مگر جواب ہوں ہاں سے زیادہ نہیں ملا تھا۔

تب پھر وہ بھی چپ کر گئی مگر وہ انہیں تنہا چھوڑ کر نہیں گئی تھی بلکہ اس وقت تک وہیں بیٹھی رہی تھی جب تک وہ کام سے فارغ نہیں ہو گئی تھیں۔

اور پھر اگلے کئی روز تک اس نے دیکھا کہ آپا گم صم ہو کر رہ گئی تھیں۔ نینا اور مینا ہمیشہ کی طرح سر جوڑ کر اسٹور روم میں گھسے رہنے کے بجائے آپا کے آس پاس منڈلاتی رہتی تھیں۔ ان دونوں کے چہروں پر مستقبل کے اندیشے زردیاں بن کر پھیل رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ وہ اچھا نہیں ہے اور پھر رات کو سونے سے پہلے وہ دل کی گہرائیوں سے دعا کیا کرتی تھی کہ آپا کی شادی نہ ہو مگر سب دعائیں قبول ہونے کی نہیں ہوتیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

آپا کی شادی کا دن آ پہنچا تھا۔ بارات کے نام پر دس بارہ لوگ گھر کے صحن میں آ بیٹھے تھے۔ چند ایک محلے دار تھے۔ دولہا سادہ سے شلوار سوٹ میں آیا تھا۔ شکل و صورت خاصی معقول تھی۔ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی بھی جھلک رہی تھی۔ وہ انہیں دور دور سے دیکھ کر آپا والے کمرے میں آ گئی۔ کچھ لڑکیاں آپا کے گرد گھیرا ڈالے اپنی ہی باتوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ اس نے گھس کر ان کے درمیان اپنی جگہ نکالی اور پھر آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی آپا کے پاس پہنچ گئی۔ وہ ابھی عام سے گھریلو حلیے میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی سی چادر میں خود کو چھپائے ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ ور نجف نے ان کا چہرہ دیکھنا چاہا مگر چادر کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے دیکھ نہ پائی۔ اس نے ان کی گود میں رکھے بے جان سے ہاتھوں کو چھو کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔

"آپا!" اس نے سر کو قدرے جھکا کر انہیں سرگوشی میں آواز دی۔ اپنی اس کوشش کے دوران وہ ان کے لرزتے کانپتے ہونٹ ہی دیکھ پائی تھی۔ تب ہی ٹپ کی غیر محسوس آواز کے ساتھ اس کے ہاتھ کی پشت پر بے رنگ پانی کا ایک قطرہ گرا تھا اور وہ اپنی جگہ سن سی رہ گئی۔

بڑی آپا رو رہی تھیں۔

"تو بے چاری مجبور و بے بس لڑکی اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا۔"

کوئی سرگوشی اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے آپا کے ہاتھوں پر رکھا ہاتھ واپس کھینچا اور بھاگتی ہوئی اسٹور میں چلی گئی۔ وہاں بستروں پر گر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اتنا کہ شاید کبھی اپنے لیے بھی نہیں روئی تھی۔ اس کے ہاتھ کی پشت پر آپا کی آنکھ سے نکلا ہوا آنسو گویا ٹھہر سا گیا تھا۔ وہ اپنے ہونٹ اسی پر رکھے آنسو بہاتی رہی یہاں تک کہ آپا رخصت ہو کر اس گھر سے چلی گئیں۔ لیکن وہ رات گئے تک وہاں سے باہر نہ نکلی تھی۔ اسے ابا، اماں اور دادی سے بے حد نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

"آپا بھی نہیں رونی تھیں۔ لیکن ان لوگوں نے انہیں رونے پر مجبور کر دیا۔" اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی اور اگلے کئی روز تک اپنے ہاتھ کی پشت اسے جلتی ہوئی محسوس ہوتی رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

بڑی آپا کی شادی کے بعد تنہائی اور عدم تحفظ کا احساس ایک دم بڑھ گیا تھا۔ پہلے وہ آپا کے ساتھ سوتی تھی۔ اب اسے اکیلے سونا پڑتا تھا۔ رات کو کئی کئی بار وہ سہم کر اٹھ جاتی اور پھر رضائی میں دبک جاتی۔

اسکول سے واپس آتی تو بولائی بولائی سی ادھر ادھر پھرتی رہتی۔ سارا گھر خالی اور ویران لگتا۔ کئی بار اسے دھوکا ہوتا کہ بڑی آپا نے اسے پکارا ہے۔ کتنی ہی دفعہ وہ باورچی خانے میں جاتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ وہ بھاگ کر وہاں جاتی اور پھر مینا آپی کو دیکھ کر افسردگی سے واپس آ جاتی۔ وہ ساری باتیں جو پہلے بڑی آپا سے کہہ دیا کرتی تھی اب دل و دماغ میں اودھم مچاتی رہتیں۔ لیکن نجانے کیسی جھجک تھی کہ وہ مینا آپی یا نینا سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ پاتی تھی۔ پڑھائی الگ متاثر ہو رہی تھی۔ اسکول میں ہم جماعت لڑکیوں اور ٹیچرز نے بھی محسوس کیا کہ وہ بالکل گم صم ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر سب کے استفسار پر وہ کچھ بھی بتانے کی

بجائے خاموشی سے سر جھکا لیتی۔

بڑی آپا شادی کے بعد ایک دوبار آئیں مگر بہت تھوڑی دیر کے لیے۔ ای ساتوں نے روپ میں لیکن وہ پہلے سے کافی کمزور دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد یہ کچھ دیر کی آمد بھی موقوف ہو گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

فلیٹ شوز بوسیدہ ہو کر کچھ اس طرح پھٹے تھے کہ اس کے دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی باہر کو نکلنے لگی تھی اور بائیں پاؤں کا انگوٹھا جو اپنا جوتا پھاڑ کر باہر جھانکنے لگا تھا۔ یونیفارم کی شلوار اس نے جیسے تیسے کھینچ کھانچ کر ٹخنوں تک کر لی تھی مگر قمیص گھٹنوں کے اوپر ہی ٹنگی رہ گئی تھی۔ سفید دوپٹہ بھی اب اسے چھوٹا اور اپنے وجود پر ناکافی لگنے لگا تھا۔

یہ وہی یونیفارم تھا جو اس نے چھٹی کلاس میں داخلے کے وقت سلوایا تھا اور اب آٹھویں تک اسی سے کام چلا رہی تھی۔ کچھ روز پہلے تک وہ مینا آپی سے خوب جھگڑتی رہی تھی کہ وہ ٹھیک طرح سے اس کے کپڑے نہیں دھوتیں پھر تنگ آکر خود ہی دھونے لگی مگر کئی کئی گھنٹے کی مشقت کے بعد بھی ان کی پیلی رنگت غائب نہ ہوئی اور اس پر واضح ہو گیا کہ اب اس کپڑے میں چمک دمک کا نام و نشان بھی نہیں رہا ہے۔ کپڑے کا سلا ہوا بڑا سا تھیلا جس میں ساری کاپیاں کتابیں بری طرح ٹھونسی ہوئی تھیں کندھے پر لٹکاتے ہوئے اس نے ایک نظر خود پر ڈالی تو شرمندگی کے مارے گھر سے قدم نکالنا دوبھر ہو گیا۔

”ہم لوگ اتنے کم حیثیت تو نہیں ابا کی تنخواہ، اماں کی سلائی اور مینا آپی کی کڑھائی کے پیسے مل ملا کر اتنے تو بن ہی جاتے ہیں کہ میں دو سال میں نیا یونیفارم بنوا سکوں، لڑکیوں سے منتیں کر کر کے کتابیں حاصل نہ کرنی پڑیں اور نہ ہی مہینہ بھر پہلے فیس کے لیے پریشان ہونا پڑے مگر اماں ابا کا سارا خزانہ صرف عظیم کے لیے ہے وہ تو ہمیشہ سے اچھا کھاتا آیا ہے۔ لباس آج بھی بہترین پہنتا ہے۔ اس کی ہر خواہش اس کے منہ سے نکلنے سے پہلے پوری کی جاتی ہے۔ جیب ہر وقت نوٹوں سے بھری رہتی ہے اور ایک ہم ہیں کہ واحد غربت ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ہمارے والدین نے دل کھول کر نوازا ہے ہمیں۔“

”تم رے کیا کر رہی ہو یہاں؟“ کرخت آواز پر وہ گھبرا کر چونکی۔ عظیم باہر سے آ رہا تھا۔ اسے دروازے کے پاس کھڑے دیکھ کر خوامخواہ ہی رعب جمانے لگا۔

گریبان کے کھلے بٹن بڑھے ہوئے بالوں کی لٹیں، بدرنگ شرٹ عظیم کا حلیہ کسی بھی لوفر آوارہ سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔

”سنائی نہیں دیا تجھے کیا پوچھ رہا ہوں میں؟“ عظیم نے دوبارہ آنکھیں نکالیں۔

”تجھے کیا تکلیف ہے۔ میں جو مرضی کروں۔“ وہ اس کے تحقیر آمیز لہجے پر تپ کر بولی۔

”زیادہ بکواس نہ کر ایک جھانپڑ دوں گا رکھ کے۔“ عظیم کو جواب سننے کی عادت نہیں تھی سو فوراً ہی بھڑک اٹھا۔ اس کے بگڑتے تیور دیکھ کر وہ جواب دینے کی ہمت تو نہ کر سکی بس منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس کے پاس سے گزرتی باہر نکل گئی۔

”اماں! سمجھا اس چڑیل کو زیادہ نخرے کیے تو کسی دن زبان کاٹ کے رکھ دوں گا۔“ اپنے عقب میں اسے عظیم کی دھاڑ سنائی دی تو بے بسی اور غم و غصے کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”بس یہ ہی وقعت ہے میری۔ ذلت اور صرف ذلت گھر میں بھی اور اسکول میں بھی۔“ گھر سے اسکول تک کا فاصلہ اس نے یونہی جلتے کڑھتے طے کیا تھا اور پھر کلاس میں جا کر وہ سب سے آخری بنچ پر بیٹھ گئی تھی۔ جہاں بیٹھ کر اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ وہ سب لوگوں کی نگاہوں سے چھپ گئی ہے اور یہاں بیٹھ کر وہ دوسری لڑکیوں کے صاف ستھرے چمکتے دمکتے ملبوسات اور ریڈی میڈ اسکول بیگ دیکھنے سے بھی بچی رہتی تھی جو ہمیشہ ہی اسے کمتری کے شدید احساس سے دوچار کر دیتے تھے۔ اسی احساس کے زیر اثر وہ کتنی ہی بار اسکول چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ لیکن

اس کے اندر کوئی تھا جو ہمیشہ اس کی ہمت بندھاتا تھا۔ اسے آگے بڑھنے پر مجبور کرتا تھا۔ سو گھر جا کر وہ پہلے کتنی ہی دیر جھنجلائی سی پھرتی رہتی، کبھی روتی اور پھر زیادہ ہی غصہ آتا تو کتابیں کھول کر سامنے رکھتی اور پھر رات گئے تک پڑھتی رہتی بس ایک یہ ہی راستہ سجھائی دیتا تھا اسے۔ جس کے ذریعے وہ باقی سب کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل سکتی تھی۔ سو اس نے اس راستے پر چلنے کی بجائے اس پر دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"اماں! مجھے کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔" اسے امید تو نہیں تھی کہ ضرورت پوری ہو گی، مگر پھر بھی نجانے کسی احساس کے تحت اماں سے کہہ کر بغور ان کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

"میرے پاس کوئی پیسے نہیں۔۔۔ جو تھے ان کی صبح دالیں اور چینی منگوالی تھی۔" وہی صاف، سیدھا کھرا سا جواب وہ گہری سانس لے کر ان کے چہرے سے نظریں ہٹا گئی۔

"تو میں اپنی ضرورت کہاں سے پوری کروں۔۔۔؟ اگر کہو تو کشکول لے کر باہر گلی میں نکل جاؤں۔"

ستون سے ٹیکی سوکھی زرد بیل پر نظریں جما کر اس نے بہت عجیب سے انداز میں کہا تھا۔ دادی کے بالوں میں تیل ڈالتے ہوئے اماں کا ہاتھ لمحہ بھر کے لیے تھم سا گیا تھا۔ قدرے غصیلی نظروں سے اسے گھورا جس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"تیری زبان تیرے قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے در نجف! چل دفع ہو جا یہاں سے۔ خوامخواہ میرا کلیجہ نہ جلا۔" اماں نے اسے دھتکارا تھا۔ اس کے خون میں ایک لمحے کے لیے ابال سا آیا تھا مگر اس کے باوجود وہ بڑے ضبط سے مسکرائی تھی۔

"کمال ہے مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میری ماں کا کلیجہ بھی ہے۔ خیر اماں! تو فکر نہ کر شام ہو رہی ہے تیرا بیٹا آتا ہی ہو گا۔ کلیجے میں خود بخود ٹھنڈ پڑ جائے گی۔" اس کے دل میں جمع سارا زہر اس کی زبان تک آنے لگا تھا۔

"توبہ توبہ اے جیلہ! سمجھا اسے کوئی عقل مت دے 'بتا اسے یہ گز بھر لمبی زبان اس کے اگلے برداشت نہیں کریں گے دو دن میں کاٹ کے رکھ دیں گے۔" دادی نے حسب معمول موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہا مگر وہ اس سے پہلے ہی اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

"کیا ہوا؟" نیہا نے تکیے پر غلاف چڑھاتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ نفی میں سر ہلاتی چارپائی پر گر سی گئی۔

"ابا سے کہہ کے دیکھنا۔ شاید ان ہی سے مل جائیں۔" مینا آپی نے تجویز دی۔

"چھوڑو مینا آپی! اب کیا ابا سے بھی ذلیل کرواؤ گی۔" اس نے دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپا لیا۔

"تو خوامخواہ تم بات کر کے تو دیکھنا۔" مینا آپی ان سب بہنوں سے زیادہ خوش گمان واقع ہوئی تھیں۔ آخری دم تک وہ امید کی جوت بجھنے نہیں دیتی تھیں۔

"مینا! کیوں خوامخواہ اس بے چاری کو جھوٹی آس دلا رہی ہو مجھے نہیں لگتا کہ ابا کو کبھی بھی احساس ہو گا کہ ان کے گھر میں جیتی جاگتی، سانس لیتی بیٹیاں بھی موجود ہیں۔" نیہا نے تکیہ چارپائی پر اچھال دیا جسے در نجف نے فوراً۔۔۔ سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔

"بالکل میرا تو خیال ہے کہ ابا ہمیں روحیں سمجھتے ہیں 'نہایت فرمانبردار' اطاعت گزار قسم کی روحیں جو نہ سن سکتی ہیں نہ بول سکتی ہیں اور نہ دیکھ سکتی ہیں۔ بس ضرورت پڑنے پر ان کا ہر حکم بجا لانے والی روحیں ان کو تو صرف ایک نعرہ لگانا پڑتا ہے اور پھر روحوں کا مارچ پاسٹ شروع۔" صدف کو ہر بات پر ہنسی آ جاتی تھی سو وہ اب بھی کھی کھی کرنے لگی تھی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم لوگوں نے چپ رہ رہ کر خود کو انسانوں سے روحوں میں ڈھال لیا ہو۔ جب تک ہم کہیں گے نہیں ابا کو کیسے معلوم ہو گا کہ ہمیں بھی کسی چیز کی ضرورت۔" اس کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا تھا اور وہ تکیہ پھینک کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"ٹھیک ہے میں ابا سے بات کروں گی۔" اس کے فیصلہ کن لہجے پر تینوں بہنوں نے ایک ساتھ اسے

دیکھا تھا۔

شام کو ابا روٹی پانی کھا کا فارغ ہوئے تو وہ انگلیاں چٹخاتی ان کے عقب میں جا کھڑی ہوئی۔ ابا تکیے سے ٹیک لگائے سگریٹ سلگا رہے تھے اس نے آہستگی سے انہیں پکار کر اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر جھجکتے ہوئے کچھ روپوں کا مطالبہ دہرا دیا۔

"کیا کرنے ہیں؟" ابا نے بہت عام سے انداز میں پوچھا تھا اسے قدرے حوصلہ ہوا۔

"یونیفارم لینا ہے ابا! بیگ اور جوتے بھی۔" اس نے فوراً کہہ ڈالا۔

"اچھا یعنی پوری تنخواہ لگا دوں تجھ پر، ہے نا۔۔۔؟" ابا شاید اس کی بے وقوفانہ سوچ پر ہنسے تھے مگر وہ سمجھی ابا کا موڈ خوشگوار ہے۔

"اگر زیادہ پیسے نہیں ہیں تو صرف یونیفارم لے لوں گی۔ باقی چیزیں رہنے دوں گی۔" باپ کی مجبوری کا خیال کرتے ہوئے اس نے فوراً ہی مطالبے میں کمی کر دی تھی۔

"نہ بھئی، نہ میرے پاس تو ایک بھی پیسہ فالتو نہیں۔" ابا نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنی جگہ ششدر سی رہ گئی تھی مگر ابا کی بے نیازی اور لاپروائی دیکھنے لائق تھی۔

"اگر ایسے ہی گزارہ کر سکتی ہے تو کر لے، نہیں تو اسکول چھوڑ کر آرام سے گھر بیٹھ جا، پڑھ لکھ کر بھی کون سے تیر مارنے ہیں۔ کرنا تو یہ ہی ہانڈی چولہا ہے نا اور پھر ہم نے کون سا تجھ سے نوکری کروانی ہے۔ ایویں خوامخواہ وقت اور پیسہ برباد کرنے کا فائدہ۔" ابا نے بجھی بجھی سگریٹ کا ٹکڑا زمین پر مسلا تو اسے لگا ابا نے اس کے وجود کو بھی بڑی بے رحمی سے مسل ڈالا ہے۔

"ابا! کیا ہماری ضرورتیں صرف اسی صورت پوری ہو سکتی ہیں جب آپ کے پاس فالتو پیسہ ہو اور اگر آپ کے پاس کبھی فالتو پیسے ہوئے ہی نا تو پھر۔۔۔؟" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تلخ ہو گئی تھی۔ ابا ایک دم چونک گئے تھے۔ گردن پوری طرح گھما کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"کیا کہا تو نے۔۔۔؟" جواباً وہ کچھ نہیں بولی تھی بس چند لمحے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی اور پھر نفرت سے منہ پھیر کر یہاں سے چلی گئی۔

وہ پرخیال نظروں سے اس کی پشت کو گھورتے رہے۔ وہ آٹھ بہنوں کے اکلوتے بھائی ساری عمر ایک جابر حکمران کی طرح ان پر مسلط رہے۔ بہنوں کو سونے کا نوالہ تو نہیں کھلایا البتہ شیر کی آنکھ سے دیکھا ضرور تھا۔ ان کی آواز سن کر بہنوں کی سانسیں رک جاتی تھیں۔ بیٹیوں کی طرف سے تو وہ مکمل لاپروا تھے۔ انہیں کسی گنتی میں رکھا ہی نہیں تھا مگر بہنوں پر ہمہ وقت ان کی کڑی نگاہ رہتی تھی۔ شاید اسی لیے شادی کے بعد وہ اسی گھر سے گئیں تو اب سالہا سال بعد ان کی شکل دیکھنے آ جاتی تھیں۔ مگر آج بھی ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بھائی سے آنکھ ملا کر بات کرتیں یا ان کے سامنے آواز بلند کرتیں۔ یہ ہی وصف بیٹیوں نے بھی پایا تھا۔ مگر آج در نجف کے انداز بلکہ عجیب و غریب انداز نے انہیں چونکا دیا تھا۔

"کون سی کلاس میں پڑھتی ہے یہ؟" انہوں نے پلٹ کر اماں سے پوچھا جو سونے کے لیے اپنا بستر سنبھال چکی تھیں۔

"آٹھویں میں ہے۔" انہوں نے سر کے نیچے تکیہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں! آٹھویں کا امتحان دے تو اس کا اسکول جانا بند کروا دو لڑکیاں زیادہ پڑھ لکھ جائیں تو سر پہ چڑھنے لگتی ہیں۔" انہوں نے قدرے ناراضی سے کہا تھا۔

"ہاں ہاں تو اور کیا۔۔۔؟ اس کی زبان تو ویسے بھی قینچی کی طرح کتر کتر کرتی ہے۔ ابھی عظیم سے جھگڑا شروع تو کبھی ماں کے سامنے زبان درازی۔"

سوتے میں کروٹ بدلتے ہوئے دادی کے کانوں میں ہلکی سی بھنک پڑی تھی سو وہ حسب عادت بولنے سے باز نہیں آئیں۔ بات میں اپنا حصہ ڈالا اور کروٹ بدل کر خراٹے لینے لگی تھیں۔ جبکہ کمرے میں لیٹی در نجف کی آنکھوں سے نیند ایک دم غائب ہو چکی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب مینا آپی کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں بجلی بلب کی زرد روشنی نے انہیں چونکا دیا تھا۔ انہوں نے گردن موڑ کر مندی مندی آنکھوں سے سامنے دیوار پر ٹنگی گھڑی پر وقت دیکھا تو دو سے کچھ اوپر کا وقت ہو رہا تھا۔ انہوں نے طویل سانس لیتے ہوئے دائیں طرف نظر دوڑائی۔ حسب توقع در نجف اپنی نیند اور گہری ہوتی رات سے بے نیاز فریم ہاتھ میں لیے پوری طرح مصروف تھی۔

"نجف! دو بج گئے ہیں اب بس کرو' باقی صبح کر لینا۔" انہوں نے قدرے بے زاری سے اسے ٹوکا تو جواباً" نجف نے ایک لمحے کے لیے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر "اچھا" کہہ کر دوبارہ مصروف ہو گئی۔

"بے وقوف اس طرح آنکھیں خراب ہو جائیں گی تمہاری۔ پہلے کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھی اور اب یہ فریم پکڑ لیا ہے۔" اسے نیا دھاگا سوئی میں پروتے دیکھ کر وہ خفگی سے کہنے لگیں۔

"مینا آپی! بس یہ ایک دو پھول رہ گئے ہیں اب تو قمیص مکمل کر کے ہی سوؤں گی۔" اس کے جواب پر مینا آپی نے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدل لی تھی۔ لیکن نجف کی بے آرامی کے خیال نے انہیں بھی ڈھنگ سے سونے نہیں دیا تب جیسے وہ جھنجلا کر اٹھ بیٹھی تھیں۔

"کیا ہے نجف! تم رات کو بھی چین سے سونے نہیں دیتیں۔"

"مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ بے آرام ہو رہی ہیں ورنہ میں لائٹ بند کر کے باہر چلی جاتی۔" وہ قدرے شرمندہ ہو کر بولی۔

"ہاں جیسے تب تو میں سو ہی جاتی۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی اٹھ کر اس کی چارپائی پر آ گئیں اور آنکھیں ملنے کے بعد فریم اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔

"مجھے اگر پتا ہوتا کہ تم یوں آدھی آدھی رات تک خود کو ہلکان کرتی رہو گی تو میں کبھی تمہیں یہ کام نہ سکھاتی۔" انہوں نے سوئی ہاتھ میں لے کر خود کاڑھنا شروع کر دیا تھا۔

"ایسے مت کہیں مینا آپی! میں تو آپ کو بہت دعائیں دیتی ہوں۔ یہ ہنر ہاتھوں میں نہ ہوتا تو اتنے ڈھیر سارے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے۔" اس نے اپنی تھکن زدہ پوروں کو دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں دبا لیا تھا۔

"نویں جماعت میں داخلہ لینا آسان تھوڑی ہے اور پھر اب تو اسکول بھی بدل گیا ہے۔ نیا یونیفارم' نئی کتابیں تھیں پھر سائنس کے مضامین میں تو پریکٹیکل کے لیے کاپیاں بھی الگ سے خریدنی پڑتی ہیں' اور اگر مجھے ذرہ بھر بھی امید ہوتا مینا آپی کہ اماں ابا میری ضروریات بخوشی نہ سہی بادل نخواستہ ہی پوری کر دیں گے تو میں کبھی اپنی جان نہ کھپاؤں۔ لیکن جب سب کچھ بہت صاف اور واضح دکھائی دے رہا ہے۔ تو پھر کسی خوش گمانی کو دل میں جگہ دینا میرے نزدیک بے وقوفی ہی ہے۔"

"تم اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کرنے لگی ہو در نجف۔"

مینا آپی نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا جس کے چہرے پر سنجیدگی کا عنصر اتنا نمایاں ہو گیا تھا کہ جو عام حالات میں شاید کئی برس بعد دکھائی دیتا تھا۔

"ان باتوں کو چھوٹی یا بڑی عمر سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا مینا آپی یہ سوچ تو ان رویوں کی دین ہے۔ جس کا سامنا ہم بچپن سے کر رہے ہیں۔ بہت برا لگتا ہے مجھے حد سے زیادہ برا جب ہمیں ضرورت سے زیادہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے اس گھر میں صرف عظیم رہتا ہے یا پھر ابا' اور دادی اماں بھی ہم ہی میں سے ایک ہیں مگر مصلحت کی چادر اوڑھے دوسری صف میں جا کھڑی ہوئی ہیں۔ انہیں عظیم کی ڈھال مل گئی ہے اور وہ کسی ننھے خوف زدہ بچے کی طرح سب کی نظروں سے چھپنے کے لیے عظیم کے پیچھے جا کھڑی ہوئی ہیں۔" اس کے وجود میں پنہاں تلخی پہلی بار مینا آپی پر آشکار ہوئی تھی وہ گم صم سے انداز میں اسے دیکھے گئیں۔

"باقی رہ گئے ہم تو مینا آپی! ہمیں اپنے لیے کنواں خود ہی کھودنا ہے ورنہ ہو سکتا ہے ہم پیاسے ہی مر جائیں۔" اس نے مینا آپی کی آنکھوں میں جھانک کر کہا تو وہ جھرجھری سی لے کر رہ گئیں۔

"ایسی باتیں مت کیا کرو نجف! میرا دل بہت کمزور ہے۔" رات کے تجمد سناٹے میں در نجف کی اندیشوں بھری آواز نے انہیں لمحہ بھر کے لیے سہما دیا تھا۔ نجف ان کی بات سن کر دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

"چلیں ٹھیک ہے نہیں کرتی ایسی باتیں۔" وہ چپ ہو گئی تھی۔

"نجف! تم نے ابا سے پوچھ لیا۔ کہیں داخلہ لینے پر انہیں اعتراض نہ ہو؟" چند لمحات کی خاموشی کے بعد انہوں نے پوچھا۔

"نہیں میری پڑھائی پر اعتراض صرف اس وقت ہوا تھا جب میں نے اپنی ضرورت کے لیے ان کے سامنے ہاتھ پھیلایا تھا۔ آئندہ ایسا کرنے کی نوبت آئے گی نہ انہیں اعتراض کرنے کا موقع ملے گا۔" اس کا انداز پر یقین تھا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" انہوں نے دل سے دعا کی تھی۔

"اب تم فوراً" سے پیشتر سونے کے لیے لیٹ جاؤ۔ کیونکہ تمہارا کام مکمل ہو چکا ہے۔" انہوں نے پھول مکمل کر کے دھاگا توڑا اور قمیص تہہ کر کے الماری میں رکھ دی۔ پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بتی بجھا دی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"ارے ارے تم کدھر کو کھسک رہی ہو؟"

ناشتے کے برتن اٹھاتے ہوئے در نجف نے پلٹ کر دیکھا۔ مینا صدف کو گھور رہی تھی جو دیوار پھلانگنے کو تیار کھڑی تھی۔

"کھسکنا کہاں ہے۔ بس ہمیں ذرا پڑوس تک جا رہی تھی۔" صدف نے کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"خدا کا واسطہ ہے۔ کبھی گھر میں بھی ٹک جایا کرو۔" مینا آپی رگڑ رگڑ کر سرخ اینٹوں والا فرش دھو رہی تھیں۔

"ہاں تو اور کیا؟ اب تو تمہیں گھر سے باہر نہیں گھر کے اندر دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔" نجف نے دھونے والے برتن نل کے نیچے رکھتے ہوئے کہا تو صدف قدرے چڑ سی گئی۔

"تو یہاں گھر میں بیٹھ کر کیا کروں گی' میں جھاڑو پوچا تو لگا چکی ہوں تم لوگ اب سارا دن یہاں فارغ بیٹھ کر ایک دوسرے کی سڑی ہوئی شکلیں دیکھنے اور جلی کٹی سننے سے تو بہتر ہے بندہ آس پڑوس میں جھانک آئے۔"

"ارے واہ ہم لوگ بھی تو ہیں سارا دن اسی گھر میں رہتے ہیں بلکہ میں تو کئی مہینوں سے گھر سے باہر نہیں گئی۔" نجف نے باقاعدہ اسے جتلایا۔

"ہاں بھئی تمہارا ہی حوصلہ ہے میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے اس چخ چخ میں اماں کی گالیاں' دادی کے کوسنے' ابا کی جھڑکیاں اور اب تو اس بانگڑو کے بھی پر نکل آئے ہیں۔ وقت بے وقت آنکھیں دکھانے لگا ہے۔ پھر اس گھر میں رکھا ہی کیا ہے۔ نہ اچھا کھانے کو نہ اچھا پہننے کو۔ باہر جاتی ہوں تو کم از کم اچھا کھانے کو تو ملتا ہے آج باجی حمیدہ کے گھر مہمانوں کو آنا ہے۔ ان کے ساتھ تھوڑی بھاگ دوڑ کراؤں گی۔ کچھ برتن دھلواؤں گی اور پھر پیٹ بھر بھر کے مزے کی چیزیں اڑاؤں گی' بریانی' کسٹرڈ اور قورمہ تو وہ اتنے مزے کا بناتی ہیں کہ بس۔" اس نے بڑے زور کا چٹخارا لیا تھا۔ اماں اور دادی آج گھر پہ نہیں تھیں اسی لیے وہ کھل کر اتنا بول رہی تھی۔

"اچھا بھئی میں تو چلی۔" اس نے دیوار کے ساتھ رکھے اسٹول پر قدم جمائے۔

"اور ہاں یہ اسٹول یہاں سے ہٹا دینا۔" اس نے انہیں ہدایت کی اور پھر نہایت پھرتی سے دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گئی تھی اور یہاں سے آگے

نجانے کتنی دیواریں تھیں جو اس نے سارے دن میں پھلانگی تھیں۔

مینا آپی نے تاسف سے نجف کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چرا کر کمرے کی طرف پلٹ گئی۔ جبکہ در نجف برتنوں کی چکنائی پہ نگاہ جمائے برتن دھونا بھول چکی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ ابھی ابھی استانی جی کے ساتھ اسکول میں اپنی فیس جمع کروا کے آئی تھی اور آتے ہی بڑی عجلت میں باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔

"مینا آپی! خالہ صفیہ کڑھائی کے پیسے دینے نہیں آئیں کیا ـــــ؟" جوابا" مینا آپی بغیر بولے پیاز کاٹتی رہی تھیں۔

"استانی جی کہہ رہی تھیں آج شام وہ بازار جائیں گی۔ میں یونیفارم کا کپڑا اور چادر لانے کا کہہ آئی ہوں۔ کیونکہ میرا خیال تھا خالہ اب تک پیسے دے گئی ہوں گی ایسا کرتی ہوں خود ہی جا کر معلوم کرتی ہوں پھر وہیں سے استانی کو پکڑا دوں گی۔" وہ اپنی ہی رو میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نجف! خالہ صفیہ پیسے دے گئی تھیں ـــــ" مینا آپی نے کہا تو وہ ٹھٹک گئی۔

"پہلے کیوں نہیں بتایا؟ کہاں رکھے ہیں؟"

"وہ اماں کو دے کر گئی تھیں۔" مینا آپی نے بتایا تو وہ عجلت میں باہر کی طرف لپکی۔

"نجف! تم میری بات تو پوری سن لو ـــــ" انہوں نے چڑ کر اسے روکا۔

"وہ پیسے اماں سے عظیم نے لے لیے تھے۔"

"کیا ـــــ؟" اسے دھچکا لگا۔ "لیکن کیوں ـــــ؟ وہ تو میری اپنی محنت کے تھے۔" وہ دکھ بھری حیرت سے انہیں دیکھنے لگی اور جب وہ کوئی جواب نہ دے پائیں تب وہ تیر کی طرح ماں کی طرف بڑھی۔

"اماں! وہ پیسے میرے تھے۔ آپ نے عظیم کو کیوں دیے ـــــ؟"

"اس نے دیکھ لیے تھے۔ اگر نہیں دیتی تو کئی برتن ٹوٹ جاتے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتا وہ ـــــ"

"کیوں ہنگامہ کر دیتا وہ اس کے باپ کے پیسے تھے کیا ـــــ؟ خود کما کر لایا تھا ـــــ؟" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی تھی۔

"بس اب ہو جا شروع۔" اماں نے غصے سے اسے دیکھا۔

"تو کیوں نہ ہوں شروع اماں؟ وہ میری اپنی محنت کی کمائی تھی۔ رات رات بھر جاگ کر میری آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ میری انگلیوں میں چھید ہو گئے اماں اور تم نے کس آسانی سے وہ روپے اسے سونپ دیے۔" اسے غصے سے زیادہ رونا آ رہا تھا۔

"اسے ضرورت تھی۔ وہ لے گیا جب میرے پاس آئیں گے تو ـــــ" اماں نے اسے ٹالنا چاہا مگر وہ پھٹ پڑی۔

"نہیں چاہئیں مجھے کسی کے پیسے اور پھر کیا ضرورتیں ہیں آپ کے بیٹے کی ـــــ؟ کیا میں نہیں جانتی سارا سارا دن اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ پان کے کھوکھے پر بیٹھا رہتا ہے کیا ضرورتیں ہو سکتی ہیں اس کی کوئی فلم دیکھنی ہو گی کہیں میچ کھیلنے جانا ہو گا اپنے ان لالچی اور بدخصلت دوستوں کو کسی ہوٹل کا اچھا سا کھانا کھلانا ہو گا یا پھر کسی بیٹھک میں بیٹھ کر جوئے کی بازی لگانی ہو گی' اس سے کہہ دینا اماں! کہ اس کی ضروریات کی تسکین ہم نہیں کر سکتے۔ اگر ابا کی تنخواہ اور تمہاری سلائی اس کے لیے پوری نہیں پڑتی تو جا کر کہیں محنت مزدوری کر لے مٹی گارا ڈھوئے مگر ہماری محنت پر ہاتھ صاف نہ کرے۔" وہ روتے روتے بولتی چلی گئی تھی۔

"تو دیکھ لو' بہنیں بھائیوں پر جان دیتی ہیں اور ان سے اپنے اکلوتے بھائی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی برداشت نہیں ہو رہیں۔" دادی اس پہ برس پڑیں۔

"یہ خوشیاں نہیں عیاشیاں ہیں عیاشیاں' جن کا پیٹ بھرنے لگیں گے تو ایک دن یہ ہم سب کو نگل جائیں گی پچھتائیں گے آپ سب سر پہ ہاتھ رکھ کر روئیں گے مگر پھر کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کسی کو نہیں

وہ کس رستے پر جا رہا ہے دن رات کہاں گزارتا ہے اتنے ڈھیر سارے روپے کہاں اڑاتا ہے' یہ عیاشیاں ایک روز بہت بڑی قیامت لائیں گی۔ بہت بڑی ـــــ"

دادی نے چپل اٹھا کر اسے کھینچ ماری تھی۔ ان کا خیال تھا۔ وہ بددعائیں دے رہی ہے انہیں اور ان کے بیٹے پوتے کو شام تک وہ یوں ہی کمرے میں پڑی وقفے وقفے سے روتی رہی اور دادی کی بڑبڑاہٹیں سنتی رہی۔

دروازہ کھلا اور استانی جی کی چھوٹی بیٹی آ گئی۔

"اماں نے یہ کپڑا اور چادر بھیجی ہے کہہ رہی تھیں پیسے بعد میں لے لیں گے۔" وہ کپڑے اس کے پاس رکھ گئی تھی۔ در نجف کتنی ہی دیر تک بے یقینی کی حالت میں پڑی رہی۔

"واہ میرے مولا کتنا کارساز ہے تو۔ میں جس مقام کی تھک کر گرنے لگتی ہوں تو وہیں حوصلے کی طنابیں میرے ہاتھ میں دے کر ایک بار پھر کھڑا کر دیتا ہے۔" اس کی پلکیں احساس تشکر سے بھیگ گئی تھیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس کے میٹرک کے پیپر ہو رہے تھے۔ کیمسٹری کا پیپر دے کر وہ سینٹر سے باہر نکلی تو بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ ایک تو بے تحاشا گرمی چمکتی دھوپ' اس پر ہوا بھی بند تھی۔ بڑی سے چادر میں خود کو لپیٹے پیدل گھر تک آتے ہوئے وہ بے حال ہو گئی تھی' دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوتے ہی چادر اتار کر اس نے تقریبا" پھینکی تھی اور ابھی سانس بھی نہ بحال کر پائی تھی کہ جب باہر سے عظیم دندناتا ہوا اس تک آیا۔

"کون تھا وہ لڑکا ـــــ؟" تنتنائی بگڑے بگڑے تیور اور کڑا لہجہ۔

"کون سا لڑکا ـــــ؟" باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رکی تھی اور حد درجہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"وہی تیرا کچھ لگتا جو روز گلی کے موڑ پہ کھڑا ہوتا ہے تجھے سلام پیش کرنے کو۔" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا تھا اور در نجف کی رنگت ایک پل میں اڑ گئی تھی۔ یہ کوئی نئی کہانی بننے جا رہی تھی جس کا اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا۔

"پہلے تو صرف سنا تھا آج آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" اس کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی تھی۔

"یہ بکواس نہیں حقیقت ہے' پوچھ اماں اس سے کیوں کھڑا رہتا ہے وہ صبح و شام گلی کے موڑ پہ کیوں دانت نکالتا رہتا ہے؟" اس نے باورچی خانے میں دم بخود سی کھڑی اماں کو بھی بیچ میں گھسیٹ لیا۔ وہ پوری طرح دوستوں کے بہکاوے پہ آ چکا تھا۔

"یہ اس کے دماغ کا فتور ہے اماں! اور اگر کوئی آوارہ کتا گلی کے موڑ پہ کھڑا بھی ہوتا ہے تو مجھے اس کی کوئی خبر نہیں۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"ہاں بہت معصوم ہے نا تو' ایک تجھے ہی خبر نہیں باقی تو پورے محلے کو معلوم ہے سیدھی طرح کہہ کہ بے غیرت ہو گئی ہے تو" حیا مر گئی ہے تیری' نجانے کتنے عاشق پال رکھے ہیں کہ جو ہر روز در اور روکتے ہوں۔"

"عظیم!" اس کے الفاظ ناقابل برداشت اور آواز ضرورت سے زیادہ بلند ہو گئی تو وہ چیخ اٹھی تھی۔

"میرے سامنے زیادہ چیخنے کی ضرورت نہیں ورنہ منہ توڑ کے رکھ دوں گا میں۔" وہ پہلے سے زیادہ زوردار آواز میں دھاڑا تھا۔

"اپنی حد میں رہ کر بات کرو عظیم اور کسی غلط فہمی میں مت رہنا میں وہ زبان کاٹ کے رکھ دوں گی جو مجھ پر اس قدر رکیک الزام لگائے گی۔" در نجف کا عظیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنا ہی قیامت ہو گیا تھا۔ وہ تو یوں بھڑکا تھا جیسے کسی نے بارود کے ڈھیر کو آگ دکھا دی ہو۔

"ارے تجھے تو میں چولہے میں جھونک دوں گا بے غیرت تیری اتنی جرات ـــــ" وہ کسی وحشی انسان کی طرح بھاگ کر چولہے سے جلتی ہوئی لکڑی اٹھا لایا تھا۔ مینا آپی چیخ مار کر اس کے پیچھے لپکیں۔

"عظیم! عظیم رک جا۔" اماں بھاگ کر اس کے

سامنے آگئیں۔

"تو نے سر پہ چڑھا رکھا ہے اسے، پر میں برداشت نہیں کروں گا۔" وہ غصے میں غلغل تیز سب بھلا بیٹھا تھا انہیں ایک طرف دھکا دیتے ہوئے وہ دیوانگی کے عالم میں آگے بڑھا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اس پہ وار کرتا صدف نے ششدر کھڑی نجف کو بروقت بازو سے پکڑ کر کمرے میں کھینچا تھا اور سرعت سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی تھی اور اگر وہ ایسا نہ کرتی تو سلگتی ہوئی لکڑی دروازے پر لگنے کے بجائے سیدھی اسی کے جا لگتی۔ اس دفاعی ردعمل نے اسے مزید مشتعل کر دیا تھا اور ہو سکتا تھا کہ وہ دروازہ توڑ کر ہی دم لیتا مگر اماں اور مینا آپی اسے کھینچ کھانچ کر پرے لے گئی تھیں۔ اندر کمرے میں اس پکڑ دھکڑ کی آواز سن کر وہ صدف کے کندھے سے لگی تھر تھر کانپتی رہی اور جب عظیم بکتا جھکتا گھر سے باہر نکل گیا تب نینا نے بھاگ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کہیں چوٹ ووٹ تو نہیں آئی ہے۔؟" دروازہ کھلتے ہی وہ سیدھی اس کی طرف لپکی تھی۔ وہ گم صم سے انداز میں دیکھے گئی۔ تب ہی باہر ابا کی آواز آئی اور اس کے جیسے مردہ تن میں جان پڑ گئی۔

انہیں ابا کو بتاؤں گی 'ایک باپ اپنی بیٹی پر لگا الزام کبھی برداشت نہیں کر سکتا خواہ لگانے والا اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔" وہ تیر کی طرح باہر کو لپکی تھی۔

ٹوٹے گملے کے ٹھیکرے 'یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا پانی' دادی کی بڑبڑاہٹ اور اڑے اڑے چہرے ابا کو گھر میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا دادی نے من و عن ساری صورت حال انہیں بتا دی۔

"ابا! یہ سب جھوٹ ہے بکواس میں کسی کو نہیں جانتی۔" اس نے فوراً صفائی پیش کی تو دادی چمک کر بولیں۔

"ارے عظیم نے خود دیکھا ہے اسے تیرے ساتھ ہنستے بولتے۔" دادی کا بیان پارہ چڑھا رہا تھا۔

"دیکھا تھا تو بے غیرت بن کر یہاں کیوں چلا آیا؟ وہیں اس کے دانت توڑ کر مجھے گھسیٹتا ہوا یہاں کیوں نہ لے آیا۔؟" اس کے اندر جوار بھاٹا پھوٹ رہا تھا۔

"ارے تو تو نجانے کس کس کے ساتھ آنکھ مٹکے کرتی پھرتی ہے وہ بے چارہ خواہ مخواہ کیوں دشمنیاں مول لے۔"

"خدا کا واسطہ ہے دادی! اپنے بڑھاپے کا ہی کچھ خیال کر لو۔ مت اتنا ظلم کماؤ۔" وہ بے ساختہ ہی ان کے سامنے ہاتھ جوڑ بیٹھی۔

"نجف ـــ" ابا نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔ یہ گستاخی انہیں ہرگز پسند نہ آئی تھی۔

"اگر عظیم کو تمہارا باہر نکلنا پسند نہیں تو دفع کرو پڑھائی کو۔"

"عظیم کو تو میرا سانس لینا' ہنسنا بولنا بھی نہیں پسند تو کیا گلا بھی گھونٹ لوں۔" آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

"وہ بھائی ہے تیرا 'غیرت والا ہے' جوان خون ہے' کہیں کچھ کر کرا نہ بیٹھے اور ویسے بھی یہاں پہلے کون سی ڈگریاں ـــ" وہ نجانے کیا کہہ رہی تھیں' ور نجف روتی ہوئی کمرے میں بھاگ آئی۔

"کس نے کہا کہ وہ بھائی ہے میرا بھائی ایسے ہوتے بہنوں پر الزام لگانے والے انہیں دکھ دے کر خوش ہونے والے وہ تو بہنوں کا آسرا ہوتے ہیں' مان ہوتے ہیں۔ چھایا ہوتے ہیں۔ ان کی عزت کے رکھوالے لڑکی کے کردار میں برائی ہو تو غیر اس کی تشہیر کرتے ہیں باہر سے شکایت آئی ہے اور مجھ پر الزام لگایا ہے تو گھر والوں اور وہ بھی اس نے جسے ابا میرا بھائی کہہ رہے ہیں۔"

وہ رات اس نے جاگ کر روتے ہوئے گزاری تھی۔ صبح تک وہ یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب کبھی گھر سے قدم باہر نہیں نکالے گی۔ اگلے پیپر میں تین چھٹیاں تھیں۔ اس نے نظر اٹھا کر بھی کتاب کی طرف نہیں دیکھا۔ پہلا دن بیتا' پھر دوسرا' تیسرے روز وہ بری طرح بے چین ہو گئی تھی۔ صرف دو پیپر رہ گئے ہیں اگر دے لیتی تو میٹرک ہو جاتا' وہ بے قراری سی ادھر سے

ادھر پھرتی رہی۔ کئی بار چھپ چھپ کر روئی۔ گھر کے ایک ایک فرد کے سامنے گڑگڑائی کہ کسی طرح ابا سے اجازت دلوا دو اور جب کسی نے مان کر نہ دیا تو وہ ڈھیٹ بنی ابا کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"ابا! صرف دو پیپر رہ گئے ہیں، خدا کی قسم وہ سب جھوٹ ہے۔ میں کسی کو نہیں جانتی پھر بھی اگر مجھ پہ بے اعتباری ہے تو کسی کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ دادی کو، اماں کو، بھلے نجف مجھے اسکول تک چھوڑ آئے۔ صرف دو دنوں کی بات ہے۔ دو سال کی محنت برباد ہو جائے گی۔"

ابا خموشی سے سگریٹ کے کش لیتے رہے اور وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ان کے سامنے التجا کرتی رہی اور پھر نجانے کیسے ابا نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اظہار تشکر کے طور پر ان کے پاؤں چھو کر اٹھی اور پھر ساری رات پیپر کی تیاری میں گزار دی۔

♥ ♡ ♡ ♥

شام کا وقت تھا۔ دھوپ تقریباً "رخصت ہو چکی تھی اور گھر کی دیواریں ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں کی زد میں دھیرے دھیرے سلگ رہی تھیں۔ آنگن میں غیر معمولی خاموشی کا راج تھا۔ وہ کمرے کی کھڑکی سے صحن میں پھیلتی، بڑھتی شام کو دیکھتے ہوئے بے وجہ کی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی اور سماعتیں غیر ارادی طور پر دور مساجد سے آتی اذان کی آوازوں پر مرکوز تھیں۔ مینا آپی اور نیہا اس وقت باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ اماں برآمدے کے فرش پر کپڑا بچھائے مشین کے پرزے صاف کر رہی تھیں۔ صدف حسب معمول گھر سے غائب تھی۔ دادی کی بڑبڑاہٹیں وقفے وقفے سے ابھر کر اس پرسکون ماحول میں شگاف ڈالتیں اور پھر معدوم ہو جاتیں۔ وہ کوئی دسیوں مرتبہ اسے اپنی میلی چادر دھونے کا کہہ چکی تھیں مگر وہ سنی ان سنی کر کے اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی۔ تب جیسے نیہا اکتا کر باورچی خانے سے نکلی تھی۔ ایک خفا خفا سی نگاہ اس پر ڈال کر اس نے دادی کی چادر اٹھائی اور نل کے پاس جا بیٹھی۔

"دادی کے پاس اس خدمت گزاری یا فرمانبرداری کا کوئی کھاتہ نہیں ہے۔ نہ ہی اس اطاعت گزاری پر تمغے پہنائے جائیں گے پھر خود کو ہلکان کرنے سے فائدہ ــــ" اس نے جھاگ اڑاتی نیہا کے تنتے ہوئے چہرے پہ نگاہ ڈال کر سوچا تھا تب ہی بیرونی دروازہ کھڑکا تھا۔ اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر دیکھا۔ ابا اپنی سائیکل سمیت گھر میں داخل ہو رہے تھے۔

"اوہ کہاں چلے گئے سب کے سب۔ کسی کو اتنا ہوش نہیں کہ وہ جو دن بھر مشقت کرنے کے بعد گھر آیا ہے تو اس سے دو گھونٹ پانی کا ہی پوچھ لیں۔"

ابا ابھی چارپائی پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ دادی دہائی دینے لگی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ اماں نے نیہا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تھا جس پر نیہا فوراً سے پیشتر ہاتھ دھو کر باورچی خانے کی طرف بڑھی تھی عین اسی وقت مینا آپی پانی کا جگ ہاتھ میں لیے کچن سے باہر آ گئی تھیں۔

"یہ شخص ہمارے لیے محبت و شفقت کی نہیں، خوف کی علامت ہے۔ یہ گھر میں داخل ہو جائے تو ہمیں سوچ کر بولنا پڑتا ہے۔ سہم کے قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ سانس کی آواز تک دھیمی کرنی پڑتی ہے۔ ہم اس کے سامنے آتے ہیں تو اپنے ہی وجود میں چھپنے لگتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ اور یہ ہی تو ذمہ دار ہے اس دنیا میں، اس گھر میں ہماری آمد کا پھر یہ ذمہ داری قبول کیوں نہیں کرتا، پہلو کیوں بچاتا ہے؟ ہمارے بے ضرر وجود اس کے لیے آزار ہیں مگر کیوں ــــ؟"

اس کی پرسوچ نگاہیں ابا کے پتھریلے نقوش سے الجھ رہی تھیں۔

"تو کیا کر رہی ہے ادھر۔ چل ادھر جا کے کام کر ــــ" انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں ابا نے نیہا کو ڈانٹا تھا جو دھلی ہوئی چادر تار پہ پھیلا رہی تھی۔ اس نے دیکھا نیہا کا چہرہ ایک لمحے کے لیے پھیکا پڑا تھا مگر وہ چپ چاپ باورچی خانے میں چلی گئی تھی تب ابا نے اپنے اطراف میں دیکھا تھا اور پھر دادی کے قریب ہوتے ہوئے ان کے کان پر جھک گئے تھے۔ اس نے دیکھا

دونوں ماں بیٹا بات کرتے جا رہے تھے، دادی کے چہرے پہ کراہت بکھرتی جا رہی تھی۔ ان کا انداز نجف کو قدرے مشکوک سا لگا تھا۔

"لیکن کس کے لیے ــــ؟" دادی نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا تھا۔

"اس نے تو کسی کا نام نہیں لیا۔ پر مینا بڑی ہے تو ظاہر ہے ــــ" ابا کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لیکن اس کی چھٹی حس نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے کمرے کے دروازے تک آتے ہوئے دیکھا ابا اپنی بات میں پوری طرح مگن تھے۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی کچن میں آ گئی۔ ابا اور دادی کی چارپائی باورچی خانے کی کھڑکی کے نزدیک تھی اور ساری باتوں کی آواز بخوبی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا مینا آپی کھڑکی کی جالی سے لگی کھڑی تھیں اور ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس نے سوالیہ انداز میں ان سے کچھ پوچھنا چاہا مگر انہوں نے بغیر کچھ کہے بے جان سے انداز میں کھڑکی سے سر ٹکا دیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کھڑکی تک آ گئی۔

"بیٹوں کی شادیاں کر چکا ہے۔ دونوں الگ گھروں میں رہتے ہیں۔ ایک بیٹی تھی، پچھلے سال اسے بھی بیاہ دیا۔ بیوی کئی سال پہلے فوت ہو چکی ہے کہتا تھا گھر میں کوئی دو وقت کی روٹی پکانے والا نہیں، لڑکی کا ہاتھ، ہاتھ میں دے دو گے تو زندگی سہل ہو جائے گی۔ گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی۔" ابا نجانے کس کی خوبیاں گنوا رہے تھے۔

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن امیر دین اور مینا کی عمروں میں تو ــــ" اماں نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ دادی نے تیز لہجے میں انہیں ٹوک دیا تھا۔

"آئے ہائے کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا عمروں کے فرق سے اور کوئی ایک دو تو ہیں نہیں کہ بیٹھے ڈاکٹروں، وکیلوں کا انتظار کرتے رہیں۔ خیر سے پوری لائن لگی ہوئی ہے لڑکیوں کی، ایک کو کھڑی کرو تو دوسری پیچھے سے سر نکالنے لگتی ہے، ارے میرا بچہ تو انہیں بیاہتے بیاہتے ہی بوڑھا ہو جائے گا اور اوپر سے ان کے کرتوت اللہ توبہ۔ وہ صدف ہے تو اسے میں نے کبھی گھر میں ٹکتے نہیں دیکھا۔ چھوٹی کی زبان تو فراٹے بھرتی ہے۔ دس جماعتیں پاس کر کے سمجھتی ہے دنیا جہان کی عقل خرید لی ہے۔ مجھے تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔"

دادی کو سب سے زیادہ قلق اس کے میٹرک پاس کرنے کا تھا سو موقع ملتے ہی اپنا دکھ رونے لگی تھیں۔

"اچھا تو اماں پھر ہاں کہہ دوں اسے ــــ" ابا نے اکتائے ہوئے انداز میں ان کی توجہ اصل بات کی طرف دلائی۔

"ہاں ہاں تو اور کیا۔ گھر میں آئے رشتے کو ٹھکرانا کوئی عقلمندی تو نہیں پھر امیر دین میں کمی بھی کیا ہے ــــ؟"

دادی نے ابا کے فیصلے پر بڑی سہولت سے مہر ثبت کر دی تھی، نجف نے کھڑکی کی جالیوں پر اپنے ہاتھ گاڑتے ہوئے بڑی امید سے اماں کی طرف دیکھا تھا، مگر انہوں نے بھی چپ چاپ اس فیصلے کی حمایت میں سر جھکا دیا تھا۔

"نجف ــــ! یہ مینا آپی کو دیکھو کیا ہو رہا ہے ــــ" نیہا کی متوحش آواز پر وہ بے اختیار پلٹی، مینا آپی نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، آنکھیں میچے دیوار کے ساتھ گھسٹتی ہوئی زمین پر ڈھے گئی تھیں۔

"مینا آپی!" اس نے بھاگ کر انہیں تھام لینا چاہا۔

"مینا آپی! کیا ہو رہا ہے آپ کو ــــ؟" نیہا کو پانی لاتے دیکھ کر وہ فوراً ہی ان کے ہاتھ سہلانے لگی تھی۔ مینا آپی کے بے حد سرد اور بے جان ہوتے ہاتھوں نے اسے سہما دیا تھا۔

"نیہا! نیہا! ابا سے کہو ایسا مت کریں، نیہا میں مر جاؤں گی۔" ان کا پورا وجود جیسے درد بن کر کراہا تھا۔

"خدا کا واسطہ ہے خود کو سنبھالو۔ اس طرح مت کرو ورنہ ــــ" نیہا نے ایک گھبرائی ہوئی نگاہ کھڑکی سے باہر بیٹھے افراد پر ڈالی تھی۔

"نیہا! میں سہہ نہیں پاؤں گی۔" دل میں اترتے درد کی شدت سے نڈھال ہوتے ہوئے انہوں نے اپنا سر اس کے کندھے پر گرا دیا تھا۔ ان کے جسم پر بری

طرح لرزہ طاری تھا اور آنکھوں کے پپوٹوں پر گرتے ہوئے بے تحاشا بوجھ سے نبرد آزما ہونے کی کوشش میں ان کے سرد ہاتھوں کی گرفت نجف کے بازو پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

"کسی کو بلاؤ پکارو کوئی ہے جو مجھے بچالے کوئی ہے۔" ان کی آواز لحہ بہ لحہ ڈوب رہی تھی۔ نیہا ان کے ہاتھ سہلاتے ہوئے سسکیاں بھرنے لگی تھی۔

"خدارا انہیں روک لو مجھے بچالو میں۔ میرے خواب میرے خواب۔"

ششدر سی بیٹھی نجف نے دیکھا مینا آپی کی گرفت سے اس کا ہاتھ چھوٹ رہا تھا مگر وہ کسی تھکے خوفزدہ بچے کی مانند سہارا تلاش کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے دائیں گوشے سے پانی کا قطرہ گرا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اس کے ہاتھ پر پڑتا ابا نے سرعت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اس کی ہتھیلی کی پشت پر ایک انگارہ سا سلگا تھا اور تن کی تن میں اس کے وجود کو بھڑکتے ہوئے الاؤ میں بدل گیا تھا اور اس نے جس سختی سے اپنے کندھے سے لگی مینا آپی کو نیہا کی طرف دھکیلا تھا خود نیہا بھی گرتے گرتے بچی تھی۔ وہ اپنی بے ترتیب سانسوں کے ساتھ چند لمحے اس روتی دھوتی مخلوق کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ جو اپنی کمزوری اور بے بسی کی انتہائی پست حدوں کو چھو رہی تھی۔

"کوئی دوسرا بچانے کے لیے نہیں آئے گا۔ ہمیں خود ہی لڑنا ہوگا رو دوست' خدا کا واسطہ ہے رو دوست۔ میں ہوں نا میں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ تم سن رہی ہو مینا! میں ایسا نہیں ہونے دوں گی اپنے آنسو پونچھ لو۔ میں تم لوگوں کو بچالوں گی۔"

اس نے ہوش و حواس کھوتی مینا آپی کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ وہ خود کو آسمان کی مانند بلند اور وسیع ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ اس لاچار مخلوق کو اپنے سینے میں چھپا لینا اسے بہت آسان دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی منہ زور طوفان تھا اس کے وجود میں جو بپھر گیا تھا۔ اس کی بلند ہوتی آواز میں ایسی گھن گرج' ایسی مردانگی تھی کہ باہر

چارپائی پہ بیٹھے تینوں نفوس اپنی اپنی جگہ چونک گئے تھے۔

وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس سے پہلے کہ نیہا اسے روکنے کی کوشش کرتی وہ دندناتی ہوئی ابا کے سر پہ جا پہنچی تھی۔ اسے لگا وہ بہت بہادر ہے' بہت طاقتور۔ وہ تنہا پوری دنیا کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اسے نیہا اور مینا آپی چڑیا کے ان بے پر بچوں کی طرح لگ رہی تھیں' جو پہلی بارش میں ہی زمین پر آگرتے ہیں اور بارش کے نوکیلے قطروں کو اپنے وجود پر سہنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں اور انہیں بچانے کے لیے وہ ایک دم چڑیا بن گئی تھی۔ ایسی چڑیا جو اپنے بچوں کو ہر آندھی اور طوفان سے محفوظ رکھنے کے لیے انہیں اپنے پروں تلے چھپا لیتی ہے۔

"ابا! یہ نہیں ہوگا۔ مینا آپی کی شادی ایک بوڑھے شخص سے ہرگز نہیں ہوگی۔" ابا نے بغیر بولے انتہائی کڑی نگاہوں سے سر تا پا اسے دیکھا تھا۔

"نجف! چل اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ۔" اماں نے مختصر الفاظ میں انتہائی سخت ہدایت کی تھی۔

"نہیں اماں! تم اپنی بیٹیوں کو مرتے ہوئے دیکھ سکتی ہو۔ میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"ارے کیوں نہیں بکتی ہے اسے' آج اس کے باپ کو بھی اس کے کرتوت دیکھنے دے۔" دادی نے جلتی پر تیل چھڑکا تھا۔

"ہاں دیکھ لو میرے کرتوت۔ میں اپنی ماں کی طرح بےحس نہیں ہوں' باپ کی طرح ظالم نہیں ہوں' تم سب لوگ ہمیں مار دینا چاہتے ہو مگر میں ایسا کچھ بھی نہیں ہونے دوں گی' جو تم لوگوں نے سوچ رکھا ہے۔ بڑی آپا کی طرح مینا آپی سے بھی ناانصافی نہیں ہونے دوں گی۔" اس کی مٹھیاں شدت غضب سے بھینچ گئی تھیں اور گردن کی رگیں تن گئی تھیں۔

"اچھا کیا کرلے گی تو۔۔۔؟" ابا کی آنکھیں آگ برسانے لگی تھیں۔

"میں کچھ بھی کرلوں گی مینا آپی کو زہر دے دوں گی' اس پہ تیل چھڑک کر آگ لگا دوں گی یا اس کے

دل میں چھرا گھونپ دوں گی مگر یہ سب۔۔۔ یہ سب نہیں ہونے دوں گی۔"

اس کی آنکھوں میں جنون سا اتر آیا تھا اور ابا جلتی ہوئی سگریٹ فرش پہ پھینک کر اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ چند لمحے لب بھینچے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے تھے اور پھر اس کی آنکھوں میں اٹھتی بغاوت اور نفرت تک رسائی ہوتے ہی ان کا ہاتھ گھوما تھا اور زناٹے دار تھپڑ اسے کئی فٹ دور گرا دیا تھا۔

"تیری اتنی ہمت' اتنی جرات۔۔۔" ابا نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا تھا اور اس پہ تھپڑوں کی بارش کر دی تھی۔

"ہاں ہے مجھ میں اتنی جرات' اتنی ہمت ہے کہ میں تم سب سے لڑ سکوں۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی تھی۔

"تو لڑے گی اپنے باپ سے' ارے پہلے تجھے ہی زہر نہ دے دوں' تجھے ہی آگ نہ لگا دوں بدزبان لڑکی۔۔۔" دادی الگ گلے پیٹنے لگی تھیں۔

گھر میں جیسے بھونچال سا آگیا تھا۔

نجف کی چیخ و پکار ابا کی گالیاں' کوسنے اس پہ دادی کی مزید شہہ۔۔۔

نیہا بے ہوش ہوتی مینا کو چھوڑ کر باہر کی طرف لپکی تھی۔ وہ تو پہلے ہی جھٹکے سے سنبھل نہ پائی تھی ایک مینا کی غیر ہوتی حالت کی پریشانی اس پر یہ شور شرابا اس نے پوری قوت سے چیخ کر ابا کو باز رکھنے کی کوشش کی تھی مگر آواز اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ پورے بدن پر اسی طرح رعشہ طاری ہوا تھا کہ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھ کر نجف کو بچانے کی کوشش نہ کر سکی تھی۔ الٹا اس طرح خوفزدہ ہوئی کہ گرتی پڑتی کمرے میں جا گھسی اور اپنے عقب میں دروازہ دھاڑ سے بند کر کے اس کی کنڈی بھی چڑھا دی۔ صحن سے آوازیں ابھی بھی آرہی تھیں۔

نجف کی کمزور آواز دبتی جا رہی تھی اور ابا کی دھاڑ پورے ماحول پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دوپٹہ منہ پہ رکھے سسکیاں روکنے کی کوشش کرتی ہوئی زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

"اے پاک رب! اے سوہنی ذات والے! تھوڑی نظر کرم ہم پہ بھی تھوڑی رحمت۔ تھوڑی عنایت ہم گنہ گاروں پر بھی ہم آزمائے جانے کے قابل نہیں بخش دے ہمارے گناہوں کو۔ یہ سزا ہے تو اسے معاف کر دے اے پروردگار معاف کر دے۔۔۔" وہ سجدے میں گر کر گڑگڑاتی چلی گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

رات کافی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ مینا آپی جیسے تیسے خود کو سنبھالے ایک بار پھر بند دروازے کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں' جس کے دوسری طرف پھیلی غیر معمولی خاموشی انہیں ہولائے دے رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک دروازے کو ہولے ہولے تھپتھپاتے ہوئے نجف کو پکارتی رہیں' اور پھر تھک ہار کر وہیں دروازے کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئیں اور بے بسی سے ان افراد کو دیکھنے لگیں جو سر تا پا چادریں اوڑھے صحن میں چارپائیوں پر غافل پڑے تھے۔ نیہا ان کے ساتھ بہت دیر تک جاگتی رہی تھی' لیکن وہ بہت خوفزدہ تھی اور اس نے کچھ کھانے پینے یا کسی سے بات کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

صدف نے ہمسایوں کے گھر نجف کی چیخ و پکار سنی تھی اور وہیں پر دبک گئی تھی اور پھر اسی وقت گھر میں داخل ہوئی تھی جب رات کی سیاہی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ دادی کو تو آج بہت سکون کی نیند آگئی تھی۔ ابا کچھ دیر بعد ہی گھر میں آگئے تھے اور ایک بار پھر بکنے جھکنے کے بعد چارپائی پہ لیٹتے تو جلد ہی خراٹے لینے لگے تھے۔

عظیم کا تو اس معاملے سے جیسے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ شام کو اسی افراتفری میں کھانا ڈھنگ سے تیار نہیں ہو سکا جس پر وہ چار گلاس اور کپ توڑنے کے بعد باہر نکل گیا تھا۔ تب اماں سر پہ پلو ڈالے اس کے پیچھے لپکی تھیں اور ہوٹل سے نان کباب منگوا کر اسے کھلا کر ہی دم لیا تھا اور اسی ماں کی کوکھ سے جنم لینے والی بیٹی

کمرے میں بھوکی پیاسی پڑی تھی جسے ایک بار بھی ہمدردی سے نہیں پکارا تھا اور جب مینا آپی نے دبے دبے لفظوں میں شکوہ کیا تھا تب وہ زہر خند لہجے میں بولی تھیں۔

"اپنا کیا خود ہی بھگتے گی نا کس نے کہا تھا اس سے کہ باپ کے سر پہ چڑھ دوڑے۔" اور وہ بس گم صم سی ان کا چہرہ تکتی رہ گئی تھیں۔

"نجف باہر نہیں آئی ابھی تک۔" مینا آپی کے کندھے پر اچانک ہی کسی نے ہاتھ رکھا تو وہ بری طرح کانپ گئیں۔ سر اٹھا کر انہوں نے متفکر سی نیناں کو دیکھا اور پھر گہری سانس لے کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نجف! نجف دروازہ کھولو نجف! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے تم ٹھیک تو ہو نا؟"

نیناں دروازے سے سر لگائے لگاتار اسے آوازیں دینے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے چٹخنی کے کھلنے کی آواز سنائی دی تھی اور ان دونوں کی منتظر نگاہیں بند دروازے پر جم کر رہ گئی تھیں۔

اور جوں ہی دروازے کے پٹ ذرا سے وا ہوئے تھے نیناں دروازہ دھکیل کر کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ نجف کنڈی کھول کر چارپائی پہ جا بیٹھی تھی۔ مینا آپی نے اپنے عقب میں دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھا، شام کی مارپیٹ کے نتیجے میں نجف کے ماتھے پر گہری چوٹ آئی تھی جس میں سے خون نکلنے کے بعد وہیں جم گیا تھا۔ اس کے دوپٹے پر بھی کہیں کہیں خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ کچی اینٹوں والے فرش پر گرنے کی وجہ سے اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اوپر والی سائیڈ سے بری طرح چھلی ہوئی تھیں۔ نیناں کی تو گویا جان میں جان آئی تھی کہ اسے زندہ سلامت دیکھ کر، لیکن مینا آپی کا دل جیسے کسی نے کانٹوں پہ رکھ دیا تھا۔ انہوں نے تڑپ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے تھے۔

"کیوں کیا تم نے یہ سب؟ میرے لیے صرف میرے لیے نا۔" احساس جرم اور احساس تشکر ایک ساتھ ان پہ وارد ہوا تھا۔

"خواہ مخواہ اتنی تکلیف اٹھائی تم نے 'اتنا درد سہا۔ ارے میں بھگت لیتی اپنی قسمت کو جیسے تیسے گزارہ کر لیتی اس وقت چوٹ نئی نئی تھی نا۔ سبہ نہیں پائی تم دونوں کو بھی پریشان کر دیا۔ پر تو نے کیوں زخم کھائے گڑیا! میں ٹھیک ہو جاتی نباہ کر لیتی اپنے مقدر سے۔ ابا کے حکم پر آرام سے سر جھکا دیتی۔"

"تو اب جھکا لینا سر بھگتا لینا اپنی قسمت کو اور نباہ لینا اپنے مقدر کو میں نے کون سے میدان فتح کر لیے ہیں۔" نجف نے تلخی سے کہا اور اکتاہٹ آمیز دلی کے ساتھ مینا آپی سے الگ ہو گئی۔

"گزارہ تو کرنا ہی ہو گا جیسے تیسے مٹی اسانس لیتے مٹی کے مادھو جو ٹھہرے' جدھر کوئی اشارہ کر دے گا ادھر کا رخ کر لیں گے۔ پہلے بڑی آپا اپنے شوہر کی معذور بیوی اور اس کے بچوں کی آیا گیری کر رہی ہیں۔ اب تم بھی اس خرانٹ بوڑھے کے ناز نخرے اٹھا لینا نیناں کے لیے کوئی شرابی جواری مل جائے گا۔ صدف کو کسی راہ چلتے سے بیاہ دیں گے اور مجھے تو شاید زمین میں زندہ ہی گاڑ دیا جائے۔ سلطنت کے حکمران کے سامنے سر اٹھانے کی گناہگار جو ٹھہری۔"

"آہستہ' آہستہ بولو نجف۔" نیناں نے اس کی بلند ہوتی آواز سے گھبرا کر اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"بے فکر رہو اب نہیں بولوں گی' ایک مرتبہ بول کر انجام دیکھ لیا ہے اور مجھے یقین ہے انجام ہر بار یہ ہی ہو گا۔" وہ بہت اکھڑے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ نیناں اور مینا آپی آنکھوں میں کئی خدشات لیے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔

"رات آنکھوں میں کاٹ لینے سے کچھ نہیں ہو گا! بہنو ای لیے بہتر ہو گا کہ اب تم بھی نیند کے مزے لوٹو۔" وہ اچانک ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"رکو نجف! میں تمہارا زخم۔۔۔"

"چھوڑیں مینا آپی! اس زخم کی پروا کسے ہے جسم پہ لگا ہے رفتہ رفتہ بھر ہی جائے گا' ہاں جو گھاؤ روح کا ناسور بنتے جا رہے ہیں ان کا کوئی علاج تمہارے پاس ہو تو

بتاؤ؟"

وہ بہت عجیب انداز میں کہتی اور انہیں دیکھتی ہوئی اپنی چارپائی پر لیٹ گئی تھی اور چادر جھٹک کر سر تک اوڑھ لی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

کائنات کی آتی جاتی گھڑیوں میں بعض گھڑیاں بہت فیصلہ کن ہوتی ہیں اور ایسی گھڑی در نجف پر بھی آئی تھی۔ فیصلہ بہت بڑا تھا مگر اچانک ہو گیا تھا۔ عین اسی وقت جب اس نے کانچ سی مینا آپی کو خضاب لگے بالوں والے عمر رسیدہ امیر دین کے پہلو میں بیٹھے دیکھا تھا۔ اس روز کوئی اور ابا سے بڑھ کر خوش نہیں تھا اور در نجف کو لگ رہا تھا کہ ابا کے حلق سے نکلنے والے قہقہے اور امیر دین کے چہرے پہ پھیلی جان دار مسکراہٹ ان کا تمسخر اڑا رہی ہے' ان کی تذلیل کر رہی ہے اور کہہ رہی ہے۔

"کیا لینے آئی تھیں تم اس دنیا میں کیوں اپنے ان چاہے وجود کے ساتھ ہم پہ مسلط ہو گئی تھیں۔ تو اگر اس دنیا میں آئی تھیں تو اب بھگتو تم سی ارزاں ذات کے ساتھ بھلا اس سے بہتر سلوک اور کیا کریں۔۔۔؟"

یہ ہی وہ وقت تھا جب ایک فیصلہ کن ساعت اس کے دل پہ آ کر ٹھہری گئی تھی۔ اس نے استانی کو اپنے شوق کا اپنے جنون کا احوال سنایا تھا۔ استانی اس کی لگن سے واقف تھیں۔ اس کی ذہانت کی معترف تھیں۔ انہیں یہ بھی اندازہ تھا کہ اگر وہ اس گھر میں رہی تو اس کا انجام دوسری بہنوں سے مختلف نہیں ہو گا۔ بلکہ ان سے بھی بدتر ہو گا کیونکہ وہ احتجاج کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اپنے حق کے لیے زبان کھول سکتی تھی۔ انہوں نے اسے ایک ایڈریس دیا تھا جو ان کی رشتے کی بہن کا تھا۔ وہ بیوہ تھیں اور کسی گھر میں ملازم تھیں۔ اس گھر میں انہیں سرونٹ کوارٹر بھی ملا ہوا تھا۔ اس نے نم آنکھوں سے شکریہ ادا کر کے وہ ایڈریس لے لیا تھا اور اس شام جب بڑی آپا صرف دو دن کے قیام کے بعد واپس اپنے سسرال جا رہی تھیں تو وہ اس طرح ان سے گلے ملی تھی گویا انہیں اپنے اندر جذب کر لینا چاہتی ہو۔ اس کے اس والہانہ انداز پر بڑی آپا کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور رات گئے جب سب لوگ خواب و خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے وہ جاگ رہی تھی اس کی کھلی نیند سے عاری آنکھیں آسمان پر لگی ہوئی تھیں بدن پر اوڑھی چادر کے نیچے اس کا ہاتھ کپڑے کے سلے ہوئے تھیلے پر تھا جس میں وہ اپنا ضروری سامان اور کچھ روپے رکھ چکی تھی۔ تیاری مکمل تھی مگر دل تھا کہ ترازو کے کانٹے پر رکا تھا۔ کبھی ایک طرف جھک جاتا تو کبھی دوسری طرف۔ وہ اپنے فیصلے پر عمل کرنے یا نہ کرنے کے درمیان ساکت تھا۔

"یہ اچھی بات نہیں اگر کچھ بھی ویسا نہ ہوا جیسا تم نے سوچ رکھا ہے تو۔۔۔؟" کوئی اسے اندر سے کمزور کر رہا تھا۔

"رسک لینا ہو گا اگر یہاں رہی تو میرے ساتھ بھی یہ ہی کچھ ہو گا۔" مستقبل کے اندیشے اور خدشات اسے فرار پر مجبور کر رہے تھے۔

"پیچھے رہ جانے والوں کی کوئی پروا نہیں۔۔۔؟" احساس جرم کچوکے لگا رہا تھا۔

"ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ اپنے لیے کوشش تو کر دیکھوں۔" وہ تھوڑی خود غرض ہوئی۔

"تمہاری اس حرکت سے پیچھے رہ جانے والوں کی زندگی مزید بدتر ہو جائے گی۔" وہ انجام سے بے خبر نہیں تھی۔

"بدتر تو اب بھی نہیں۔" اسے ادراک تھا۔

"لوگ بیٹیوں کے مر جانے کی دعا کیا کریں گے۔" دنیا کا خوف حاوی ہوا۔

"ایسی زندگی دینے سے تو بہتر ہو گا۔" اپنی ذات کی پائمالی اسے منظور نہ تھی۔

"ماں باپ کے لیے طعنہ بن جاؤ گی۔"

"فخر کا تمغہ بھی میں ہی پہناؤں گی۔" اسے یقین تھا۔

"اللہ اکبر۔" قریبی مسجد سے آواز ابھری تھی۔ وہ

بری طرح چونک گئی۔ بس اسی وقت کا انتظار تھا۔ اس نے نڈھال ہوتے دل کو حوصلے کی طنابیں تھمائیں اور چادر ہٹا کر چارپائی سے نیچے اتر آئی۔ چند لمحوں کے لیے سب کے غافل ہونے کا یقین کرتے ہوئے اس نے اپنے سامان کے تھیلے کو مضبوطی سے دبوچا اور اپنی اتھل پتھل سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف آگئی۔

"اگر کوئی اٹھ گیا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا۔۔۔؟"

اندھیرے میں سینکڑوں نگاہیں اسے گھورتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے اس کا حلق خشک ہونے لگا تھا اور زبان سوکھ کر تالو سے جا لگی تھی۔ اس نے تاریکی میں دروازے کی بند کنڈی کو ٹٹول کر کھولنا چاہا تھا مگر عین اسی وقت اس کے عقب میں چارپائی ہولے سے چرچرائی تھی اور کنڈی اس کی پسینے میں بھیگی کپکپاتی پوروں سے چھوٹ گئی تھی۔ رات کے سناٹے میں چھناکے کی ہلکی سی آواز ابھری تھی اور اسے سن کر گئی تھی۔ اپنا بھیانک انجام سوچنے میں اسے ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔ وہ ساکت و جامد اپنی جگہ کھڑی رہی مگر اس کی پشت پر ایک بار پھر ویسی ہی خاموشی چھا گئی تھی۔

اس نے گویا سانس روک کر گردن موڑی۔ ہر وجود بے حس و حرکت تھا۔ دادی کے لمبے لمبے سانسوں اور ابا کے خراٹوں کی آواز بہ خوبی سنائی دے رہی تھی۔ عظیم کی چارپائی چھت پر تھی۔ اماں نے حسب عادت سوتے میں اپنا چہرہ دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ صدف کی نیند تو ہمیشہ سے بہت گہری ہوتی تھی اور اس کے ساتھ خود اس کی اپنی چارپائی خالی تھی۔

"اور جب صبح کو یہ چارپائی یونہی خالی پڑی ہوگی تو کون سی قیامت ہوگی جو اس گھر پہ نہیں آئے گی۔"

اس نے جھرجھری لیتے ہوئے نگاہیں ہٹالیں۔ اس کی چارپائی کے عین برابر نینا کی چارپائی تھی جو صبح سے گم صم تھی اور جس کی آنکھوں میں حد درجہ وحشت اور ویرانی بھر گئی تھی۔

"خدا حافظ۔" اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی تھی اور آنکھوں میں دھند سی اترنے لگی تھی اور اس دھند کے پار نہ جانے کیوں اسے لگا تھا کہ نینا کی آنکھیں کھلی ہیں اور اسے دیکھ رہی ہیں۔ دہشت اور دکھ کا ایسا عجیب لمحہ تھا کہ اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رو دینے کو چاہا۔ خود پہ قابو پانا بہت مشکل تھا۔ بے تحاشا سراسیمگی کے عالم میں اس نے دروازے کے پٹ وا کیے اور باہر نکلنے کے آخری لمحہ تک اسے یہ ہی محسوس ہوا تھا کہ نینا جاگ رہی ہے اور اسے دیکھ رہی ہے۔ دروازے کے سامنے بنی دو چار بوسیدہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ سختی سے ہونٹوں پر جماتے ہوئے اپنی بے قابو سسکیوں کو دبانا چاہا تھا۔ گلی میں آکر اس نے اپنے لڑکھڑاتے قدموں میں تیزی بھری تو سسکیاں ہچکیوں میں ڈھل گئی تھیں۔ وہ قدم بہ قدم گھر سے دور ہوتی جا رہی تھی اور نینا کی آنکھوں نے ابھی تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ گلی بالکل سنسان تھی پہلا موڑ مڑتے ہی اس نے غیر ارادی طور پر بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

وہ رو رہی تھی اور بھاگتی جا رہی تھی صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی جب ہی بس اسٹاپ آگیا تھا۔ اس کی ہچکیاں دم توڑ گئی تھیں اپنا آنسوؤں میں بھیگا چہرہ اس نے چادر میں چھپایا تھا اور لپک کر اسٹارٹ ہوتی بس پہ سوار ہو گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

تین، چار گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر کے بعد بس بالآخر رک گئی تھی۔ لیکن اس کے چلتے ہوئے پیروں میں تھرتھراہٹ ابھی بھی موجود تھی۔ سیاہ چادر سے منہ لپیٹے وہ بہت گم صم سی بیٹھی تھی اور کسی گہری سوچ میں تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھی خاتون نے اسے ہلکا سا ٹہوکا دیا۔

"اترنا نہیں ہے کیا۔۔۔؟"

اس نے ہلکا سا چونک کر اس عورت کی طرف دیکھا جو اسے گہری نگاہوں سے جانچ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں در نجف کے لیے شک ہی شک تھا۔

"اکیلی ہو؟ تمہارے ساتھ کوئی نہیں۔۔۔؟"

عورت کا لہجہ تجسس لیے ہوئے تھا۔ وہ جواباً چپ چاپ بیٹھی رہ گئی تھی۔ گھر سے تو بہت کچھ ساتھ لے کر نکلی تھی وہ مگر اب سب کچھ ادل بدل ہو گیا تھا۔ بلند حوصلگی، کم ہمتی میں بدل گئی تھی۔ پختہ ارادے بھر بھری ریت کی طرح ڈھے گئے تھے۔ اپنے پندار، اپنی ذات، اپنے تشخص کو بچانے کی خواہش، اب شدت سے کسی پناہ کی طلب میں بدل گئی تھی۔

"واہ نجف بی بی! چار گھنٹے کی مسافرت میں ہی سب کچھ کھو دیا۔ ابھی تو آغاز سفر ہے، ابھی سورج سوا نیزے پر نہیں پہنچا اور ابھی تو رات کی تاریکی بہت دور ہے۔ پھر ابھی سے کچھ سجھائی کیوں نہیں دے رہا۔" اسے ان ہتھیاروں کے کھو جانے کا افسوس ہوا جن کے آسرے پہ وہ گھر سے نکلی تھی۔

"اے لڑکی! گونگی بہری تو نہیں ہو تم۔۔۔؟ دیکھ بھی سکتی ہو کہ نہیں۔۔۔؟ بس ساری کی ساری خالی ہو گئی اور تم ہو کہ میرا راستہ روکے بیٹھی ہو۔" وہ عورت اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر قدرے ناراضی سے چلائی تھی۔

نجف نے ہلکی سی جھرجھری لے کر اپنی زائل ہوتی قوتوں کو سمیٹا اور منجمد وجود کو بہ وقت حرکت دیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بس سے نیچے اتری تو چلتے پھرتے انسانوں کا ایک اژدھام گویا اس کو نگل لینے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

ٹریفک شور، ہنگامہ، ہارن۔ کی آوازیں، لوگوں کی چیخ و پکار، پریشان حال گرمی کی شدت سے گھبرائے ہوئے مسافر، سیٹیاں بجاتے ہوئے منچلے کنڈیکٹر، چائے، شربت بنانے والے نان کبابوں کی آوازیں لگانے والے۔ زمین پہ پہلا قدم رکھتے ہی اسے یوں لگا تھا جیسے پوری کائنات لمحہ بھر کے لیے زور سے گھومی ہو، اور پھر ایک نقطے پر آکر رکی ہو اس نے جسم کے ایک ایک مسام سے پھوٹتے پسینے کو محسوس کرتے ہوئے قدم آگے بڑھائے اور رش سے قدرے باہر آگئی تب ہی ایک ٹیکسی والا اس کی طرف بھاگا بھاگا آیا تھا۔

"آؤ، آؤ بی بی جلدی کرو۔" اس نے نجف کے بازو کو چھوتے ہوئے کہا تو وہ جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"نن، نہیں مجھے کہیں نہیں جانا۔" ٹیکسی والا اس کے جواب سے بدمزہ ہو کر کسی اور کی طرف لپکا تھا اور ابھی وہ دو قدم بھی چل نہیں پائی تھی، جب ایک رکشہ اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔

"کہاں چلنا ہے جناب۔ کرائے کی بات نہیں بنی تو ہمارے ساتھ آجائیے، بالکل مناسب کرایہ ہوگا۔"

اس نے اپنے پان سے رنگے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے نہایت گھٹیا انداز میں کہا تھا۔ نجف کو اور کچھ نہیں سوجھا تو پاس سے گزرتی ایک عورت کے ساتھ چل پڑی۔ رکشہ ڈرائیور نے جیب سے ماچس کی تیلی نکال کر دانتوں میں خلال کرتے ہوئے بہت دور تک نظروں ہی نظروں میں اس سہمی چڑیا کا تعاقب کیا تھا۔

در نجف کچھ دیر تک اس عورت کے شانہ بشانہ چلتی رہی، لیکن جب ایک دو بار اس عورت نے نہایت عجیب نظروں سے گھورا تو اس کے قدموں کی رفتار خود بخود سست پڑ گئی اور کچھ دیر بعد وہ اس عورت سے علیحدہ ہو کر فٹ پاتھ پہ چلنے لگی تھی۔ چہرے سے پھسل جانے والی چادر کو درست کرتے ہوئے اس نے اپنا پسینہ خشک کیا اور اطراف میں دیکھنے لگی۔ بھاگتی دوڑتی ٹریفک کا بے تحاشا شور اس کے دل و دماغ میں ہیجان برپا کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ہر چیز، ہر انسان اس کائنات میں اپنے اپنے مقام پہ موجود ہے مگر صرف ایک وہ ہے جو اپنے مقام سے ہٹ گئی ہے۔ جو ہواؤں میں معلق ہے۔

جس کے قدموں تلے بچھی زمین نے بے رخی سے اپنا دامن سمیٹ لیا ہے اور جس کے سر پہ تنا آسمان بھی اسے پناہ دینے کے بجائے اپنی ازلی بے نیازی کے ساتھ اسے نظر انداز کر رہا ہے۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ ایک چار دیواری اور ایک چھت کے نیچے بیٹھ کر منصوبہ بنانا کس قدر آسان ہے اور کھلے آسمان کے نیچے بے یار و مددگار کھڑے ہو کر کسی کو مدد کے لیے

پکارنا کس قدر دشوار ہے۔ اس نے تو سوچا تھا کہ بس سے اترتے ہی سواری پکڑے گی۔ اور وہ اسے مطلوبہ ایڈریس پر پہنچا دے گا۔ مگر اب ایک خوف تھا جو پوری طرح اس پر حاوی ہو گیا تھا۔ اب اسے ہر رکشہ ڈرائیور ایک لٹیرا لگ رہا تھا۔ ہر ٹیکسی ڈرائیور کی نگاہیں ہوس ناک لگ رہی تھیں، ہر بارونق ٹوپی سوانگ رچائے لگ رہا تھا۔ ہر راستہ گویا کھائی طرف جاتا محسوس ہو رہا تھا اور ہر قدم گویا دلدل میں دھنستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"کیا کروں ــــ؟" اپنے سامنے سے گزرتے لاتعداد انسانوں میں سے کسی ایک کو بھی وہ مدد کے لیے نہ پکار سکی تھی۔ بے جان ہوتی ٹانگوں نے بھی جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تو وہ جیسے مجبور سی ہوتی ہوئی، مرے مرے قدم اٹھاتی فٹ پاتھ کے دوسری جانب لگے شہتوت کے درخت کے نیچے ڈھے گئی تھی۔ ارد گرد کوئی بھی موجود نہیں تھا اس نے چہرے سے چادر ہٹا دی تھی اور لمبے لمبے سانس لے کر جیسے رکتی ہوئی سانسوں کو بحال کرنے لگی۔ گھڑی بھر کے لیے وہ کچھ پرسکون ہوئی تو دھیان خود بخود اسی گھر کی طرف چلا گیا جہاں اس وقت یقیناً "ایک کہرام مچا ہوا تھا۔

"اور نینا، صدف کیا سوچ رہی ہوں گی میرے بارے میں۔ مینا آپی کو بھی خبر ہو گئی ہو گی اور آج میرے کیے کا عذاب بھی ان پر نازل ہو گا۔" اس کے آنسو جلتے بلکتے دل پہ گرنے لگے تھے۔

"معلوم نہیں اماں کو دکھ ہوا ہو گا یا وہ غصے میں آ کر دادی کے ساتھ مل کر میرے مر جانے کی دعا کر رہی ہوں گی ــــ؟" اس نے ان ہی پسینے سے تر ہتھیلیوں کو چادر سے رگڑا۔ تب ہی اس کے قریب ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا اس نے بری طرح گھبرا کر سر اٹھایا۔

"ٹھنڈا پانی۔" ایک نوعمر لڑکا ہاتھ میں کولر اور گلاس لیے کھڑا تھا۔

اس نے اپنے خشک پپڑی زدہ ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اثبات میں سر ہلانا چاہا مگر اسے خود سے کیے گئے وعدے یاد آ گئے تھے۔

"سفر میں کسی سے کچھ لے کر نہیں کھانا کچھ پینا نہیں۔ اور نیند بھی نہیں آنی چاہیے۔ کیا خبر دشمن گھات لگائے بیٹھا ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی کہ کوئی مجھ پر قابو پا سکے۔" وہ کم عمر تھی مگر جانتی تھی کہ کس چیز کے چھن جانے کا خطرہ ہے اور یہ کہ اس کے پاس سب سے قیمتی چیز کیا ہے۔

"نہیں، نہیں چاہیے۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا مگر پیاسی آنکھوں نے بہت دور تک اس لڑکے کے جاتے قدموں تک پیچھا کیا تھا۔ وہ چلا گیا تھا لیکن اسے احساس دلایا گیا تھا کہ وہ کئی پہر سے بھوکی ہے۔ آج صبح سے نہیں پرسوں رات سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ایک رات وہ احتجاجاً بھوکی رہی تھی اور دوسری رات اس لیے بھوکی رہی تھی کہ وہ مینا آپی کی قبر پہ چڑھائے گئے گوشت اور زردے سے اپنے شکم کو پُر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے شہتوت کے تنے سے ٹیک لگا کر خالی نظریں خاکستری زمین پہ گاڑ دی تھیں۔ تب ہی ہلکی سی ہوا چلی تھی اور ٹپ ٹپ کی آواز کے ساتھ سیاہی مائل سبز شہتوت اس کی گود میں آ گرے تھے۔ اس نے ایک بے تاب سی خواہش کے ساتھ یہ میوہ اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے سر اوپر اٹھایا۔ سرسبز ٹہنیاں اس کے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ پھیل گئی۔ اسے اپنا آپ ایک ایسے مست الست بھکاری کی مانند لگا تھا۔ جو بے سروسامانی کے عالم میں کسی درخت کے نیچے آ بیٹھا ہوا اور قدرت اس کے لیے کھانے کا بندوبست کر رہی ہو اور اسی لمحے اسے خیال آیا تھا کہ دنیا تیاگ دینے کے لیے گھر سے نہیں نکلی تھی۔

"کب تک بیٹھی رہوں گی یہاں ــــ؟" آسمان کے عین وسط میں انگارہ بنے سورج پر زوال کی ابتدائی گھڑیاں اترتے دیکھ کر اس نے فکر مندی سے سوچا۔

"شام اور پھر سیاہ، تاریک رات۔" آنے والی گھڑیاں یکلخت ہی پھنکار اٹھیں۔

"مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ کسی سے مدد کوئی ہمدرد۔" شدت گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے وہ اپنے تھیلے سمیت اٹھی اور سڑک کی طرف آ گئی۔

"کیا کروں ــــ؟ رکشہ لے لوں ــــ؟ یا ٹیکسی ــــ؟ راستوں کا علم نہیں اگر کسی اور جانب لے گیا تو؟"

نہایت تکلیف دہ سوچ دل میں ابھری تھی اور ابھی کوئی فیصلہ بھی نہ کر پائی تھی جب اچانک ہی شور مچاتا رکشہ اس کے نزدیک آ کر رک گیا تھا۔ اور ڈرائیور کو دیکھتے ہی اس کی روح تک فنا ہو گئی تھی۔ یہ وہی شخص تھا جس سے اڈے پر بس سے اترتے ہی اس کا ٹاکرا ہوا تھا۔

"ابھی تک ادھر ہی گھوم رہے ہو جناب! ہمیں خدمت کا موقع کیوں نہیں دیتے۔" وہ نہایت عیاری و مکاری سے مسکراتے ہوئے سراپا اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

در نجف نے بے تحاشا دھڑکتے ہوئے دل پہ قابو پا کر کڑی نگاہوں سے اسے گھورا تھا اور پھر اس کے سامنے سے ہٹ کر ایک طرف چلنے لگی۔ اسی وقت اس نے رکشہ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔

"میں نے کہا بادشاہو! ہم سے کوئی خفگی ہے کیا ــــ؟" اسے اپنے برابر رکشہ چلاتے دیکھ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ فوری طور پر اسے اور کچھ نہیں سوجھا تو وہ سڑک کراس کر کے ایک ذیلی سڑک کی طرف مڑ گئی اور ابھی وہ سکون کا سانس بھی نہیں لے پائی تھی، جب اس نے اپنے عقب میں ایک بار پھر رکشہ رکنے کی آواز سنی وہ گھبرا کر پلٹی۔ وہ رکشہ اسی سڑک کے عین سامنے روک کر خود نیچے اتر رہا تھا۔

"یہ میرا پیچھا کیوں کر رہا ہے؟" اسے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کوئی راہ فرار ڈھونڈنے لگی تھی۔ یہ سڑک غالباً اس کالونی کی مین روڈ تھی کیونکہ یہاں دائیں بائیں کتنی ہی چھوٹی چھوٹی سڑکیں نکل رہی تھیں۔ وہ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بغیر سوچے سمجھے پہلا موڑ مڑ گئی تھی۔ یہاں غالباً "رہائشی کوٹھیاں تھیں اور اس چھوٹی سی سنسان سڑک پر اپنی ہی سانسوں کی سرسراہٹ اور اپنے ہی پیروں کی چاپ سنتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ بہت بڑی غلطی کر چکی ہے۔ سڑک پر تو لاتعداد افراد موجود تھے۔ وہاں یہ شخص اس سے بدتمیزی نہیں کر سکتا تھا، لیکن اب اگر وہ کوئی گڑبڑ کر دیتا تو وہ اس کا کیا بگاڑ لیتی۔

"نہیں اگر اس نے کوئی بدتمیزی کی تو میں چیخنے چلانے لگوں گی۔ اس کا چہرہ لہولہان کر دوں گی خود پر حاوی نہیں ہونے دوں گی۔"

اپنے جسم کو سرد اور کمزور محسوس کرتے ہوئے اس نے خود کو حوصلہ دیا تھا اور قدموں کی رفتار پہلے سے بھی تیز کر دی تھی۔ مگر عقب میں نزدیک ہوتی قدموں کی چاپ سن کر اس کی رہی سہی قوتیں بھی زائل ہوتی جا رہی تھیں۔ معلوم نہیں وہ شخص واقعی اس سے کوئی بدتمیزی کرنا چاہ رہا تھا یا خواہ مخواہ اسے ہراساں کر کے حظ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ لمحات نجف کے لیے قیامت کی گھڑیوں سے کم نہ تھے اپنے اور اس کے درمیان ختم ہوتے فاصلے کو بڑھانے کے لیے وہ تقریباً بھاگنے لگی تھی۔

"ارے رکو سنو تو سہی ــــ" وہ عقب سے پکار رہا تھا اور در نجف کو اس کی آواز ایک ایسے گدھ سے مشابہہ لگی تھی جو چڑیا کے بال و پر سے بے نیاز بچے کو اپنے ظالم اور بے رحم پنجوں میں دبوچ کر اڑ جانا چاہتا ہو۔ در نجف نے ٹوٹتی سانسوں اور سفید پڑتے چہرے کے ساتھ دیکھا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"نہیں یا اللہ ــــ" خوف و دہشت سے بے حال ہوتے ہوئے اس نے پوری قوت سے بھاگنا شروع کر دیا تھا اور بھاگتے ہوئے وہ اپنے اور اس شخص کے درمیانی فاصلے کے تعین کے لیے بار بار پلٹ کر دیکھ رہی تھی اسی عالم میں دوڑتے ہوئے نجانے کیا چیز سامنے آئی تھی کہ وہ زوردار ٹھوکر کھا کر بری طرح گھٹنوں کے بل زمین پہ جا گری تھی۔ غیر ارادی طور پر ہی ایک طویل

چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی وہ منحوس شخص اپنے مکروہ چہرے پہ غلیظ مسکراہٹ سجائے اس کے سر پہ آکھڑا ہوا تھا۔

"ارے کیوں گھبرا رہی ہو خوامخواہ ہم تمہیں کوئی نقصان تھوڑی پہنچائیں گے۔" وہ اس کی طرف قدرے جھک کر مسکرایا۔

"دیکھو تم خبردار جو——" اس نے لاکھ بہادر بننے کی کوشش کی تھی مگر اس کی حلق میں پھنستی آواز اور ذرا سہما انداز اس کے سب راز فاش کر گیا تھا اور اس ہوس پرست انسان کو مزید شہہ دے گیا تھا۔

"دیکھ ہی تو رہا ہوں چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔" وہ نجانے کیا بکواس کر رہا تھا نجف اپنے خطا ہوتے اوسان سمیت سن نہ پائی تھی۔ اسے تو بس اس بھیڑیے کی آنکھوں کی بڑھتی ہوئی چمک نظر آ رہی تھی۔

"اگر، اگر تم نے مجھ سے بدتمیزی کی تو—— تو میں شور مچا دوں گی۔" وہ کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح آنکھیں پھیلائے —— اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر اس کی دھمکی نے سامنے والے پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ بلکہ وہ نہایت ڈھٹائی سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔

"ارے شور مچاؤ گی تو مجھ جیسے دو چار اور نکل آئیں گے یہاں، مفت کا مال بھلا کسے برا لگتا ہے۔ اب زیادہ نخرے مت دکھاؤ اور چلو میرے ساتھ۔" اس کا لہجہ اور تاثرات ایک دم ہی بدل گئے تھے۔

"نہیں چلو گی تو ابھی میں سب لوگوں کو اکٹھا کر کے تمہارا پول کھول دوں گا۔ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ سب میری بات کا اعتبار کریں گے صرف میری بات کا۔ چل میرے ساتھ۔"

اسے نفی میں سر ہلاتے دیکھ کر وہ جارحانہ تیوروں سے اس کی طرف بڑھا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے کلائی یا ہاتھ سے پکڑ کر قابو میں کرتا اس نے کسی ان دیکھی قوت کے زیر اثر اسے زوردار دھکا دیا تھا اور اپنی گرتی ہوئی چادر کو بھول کر سرپٹ وہاں سے بھاگی تھی۔ عالم وحشت میں اندھا دھند بھاگتے ہوئے اسے اپنے پیچھے بھاگتے قدموں کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دے رہا تھا یہی وجہ تھی کہ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے وہ سامنے سے آتی گاڑی کو بھی نہ دیکھ پائی تھی اور اپنی ہی دھن میں بھاگتی ہوئی زوردار طریقے سے اس گاڑی سے جا ٹکرائی تھی۔ گاڑی کے بریک پوری قوت سے چرچرائے تھے اور دور نجف کا پیچھا کرتے ہوئے شخص نے اسے گاڑی سے ٹکرا کر—— گرتے دیکھا تو وہیں سے ایک بغلی گلی میں داخل ہو کر بھاگ نکلا تھا۔

جبکہ ایک نوجوان سرعت سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا ساتھ ہی پچھلے دروازے سے اس کا ڈرائیور بھی نکل آیا۔ وہ بھاگتا ہوا نجف کی طرف آیا جو تپتی ہوئی سڑک پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ سیاہ گاگلز ہاتھ میں لے کر وہ فوراً" پنجوں کے بل بیٹھ کر اس پر جھکا تھا۔

"او گاڈ۔" نجف کے ماتھے سے بہتا خون دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس نے فوراً" سے پیشتر کلائی تھام کر اس کی نبض کا معائنہ کیا اور پھر ہاتھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے سر جھٹکتے اور بڑبڑاتے ہوئے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پہ وقت دیکھا اور پھر پیشانی پہ ہاتھ مار کر رہ گیا۔

"کیا کیا جائے——؟" اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

"صاحب آپ کو دیر ہو رہی ہے۔"

"ہاں، لیکن——" وہ سوچتے ہوئے پھر واپس پلٹ کر دوبارہ نجف کی طرف جھکا۔ اس کے ہوش میں آنے کے کوئی آثار نہ دیکھ کر اس نے جیسے کوئی آخری فیصلہ کیا۔ اسے اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا پھر دروازہ بند کرتے ہوئے یونہی سرسری سی نظر اس جگہ دوڑائی جہاں وہ گاڑی سے ٹکرائی تھی کچھ فاصلے پر اسے ایک چادر اور بیگ نما کوئی چیز دکھائی دی تو ڈرائیور کو انہیں اٹھا لانے کا کہا اور پھر وہ چادر نجف کے بے ہوش وجود پہ ڈال دی اور ابھی اس نے ڈرائیونگ

سیٹ پہ بیٹھنے کا ارادہ ہی کیا تھا جب خیال آیا کہ نجف کو اٹھاتے ہوئے وہ اپنے گلاسز وہیں سڑک پہ رکھ آیا تھا۔

"میری فلائٹ اسی چکر میں گول ہو کر ہی رہے گی۔" وہ سخت جھنجلا کر بھاگا تھا اور گلاسز آنکھوں پر چڑھا کر ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرنے سے پہلے اس نے پلٹ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا اور اس بے سدھ وجود کو جوں کا توں پڑے دیکھ کر اس نے تاسف سے سر جھٹکا اور گاڑی موڑ کر فل اسپیڈ پہ چھوڑ دی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

دانیال حسن گم صم سے انداز میں کھڑکی سے باہر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ جب دھاڑ کی آواز سے ان کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا۔ انہوں نے بری طرح چونک کر دیکھا تو چند لمحے کے لیے انہیں اپنی بصارت پہ یقین نہیں آیا۔

"رضا! تم؟ تمہیں تو اس وقت ایئرپورٹ پہ ہونا چاہیے تھا——؟"

"ضرور ہونا چاہیے تھا ایئرپورٹ پر، اگر راستے میں ایک نئی مصیبت نازل نہ ہو گئی ہوتی وہ تو شکر کہ بروقت بریک لگ گئے ورنہ اس وقت وہ خود تو عالم بالا اور مجھے سلاخوں کے پیچھے بھجوا چکی ہوتی۔ نجانے کہاں سے بھاگتی آئی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھی میری گاڑی سے آ لگی۔ کسی اور کلینک یا ہاسپٹل لے جاتا تو وہاں لینے کے دینے پڑ جاتے بہرحال آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ چل کر اسے دیکھ لیجئے۔" رضا بولنے پر آتا تھا تو کسی کی نہیں سنتا تھا اور اس وقت تو یوں بھی بہت بوکھلایا ہوا لگ رہا تھا۔

"آپ جلدی کریں گے نا دیکھ لیں اسے لڑکی ہے زخمی حالت میں ڈرائنگ روم میں ہے میری فلائٹ میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔" اس نے بے حد فکرمندی سے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور ان کی وہیل چیئر دھکیلنے لگا۔

"ارے تو تم جاؤ نا میں دیکھ لوں گا۔" انہوں نے اصرار کیا۔

"نہیں اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو؟ اور میں وہاں جا کر بھی پریشان ہی رہوں گا۔" ڈرائنگ روم میں پہنچ کر رضا نے ان کی چیئر صوفے کے بالکل قریب کر دی تھی۔ ان کی ڈاکٹری نظر پہلی بار میں ہی جانچ گئی تھی کہ معاملہ سیریس نہیں ہے پھر بھی رضا کی تسلی کے لیے انہوں نے اس کے ماتھے کے زخم کو سرسری سے انداز میں دیکھا' نبض کا معائنہ کیا۔ رضا بے چینی سے صوفے کی بیک پہ جھکا تاسف بھری نظروں سے اس کے ماتھے پہ جمے خون کو دیکھ رہا تھا۔

"نہیں بھئی کوئی گڑبڑ نہیں معمولی زخم ہے غالباً" خوف کی وجہ سے بے ہوش ہے اس لیے تم تو فوراً" سے پیشتر نکل جاؤ۔" انہوں نے رضا کی طرف رخ موڑتے ہوئے کہا۔ جانتے تھے کہ امریکہ میں اس کا فائنل سمسٹر شروع ہونے والا ہے۔ اگر یہ فلائٹ مس ہو گئی تو اس کا بہت حرج ہو گا۔

"آر یو شیور——؟" وہ سیدھا ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"ون لیس ہنڈرڈ پرسنٹ۔" انہوں نے پُراعتماد طریقے سے اسے یقین دہانی کرائی۔

"اوکے پھر میں تو چلا۔" وہ بہت افراتفری میں دروازے کی طرف لپکا اور پھر وہیں سے پلٹ کر ان تک آ گیا۔

"مجھے لگتا ہے یہ ایکسیڈنٹ ہوا ہی اس لیے کہ میں آپ کو دوبارہ دیکھ سکوں۔" اس نے دونوں بازوؤں میں انہیں بھینچا ہاتھ پکڑ کر لبوں سے لگایا اور ان کی پیار بھری نظروں کے سامنے بھاگتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔

"وہاں پہنچ کر مجھے اطلاع ضرور کرنا۔" انہوں نے حسب عادت عقب سے آواز لگائی تھی۔

لڑکی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے انہوں نے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز بہت دھیان سے سنی تھی اور پھر احمد کو آواز دے کر میڈیکل باکس لانے کو کہا تھا احمد کے آنے تک وہ بے سدھ پڑی لڑکی کا جائزہ غیر ارادی طور پر لے چکے تھے۔

"زرد' پژمردہ' بے رونق چہرہ' لاغر وجود اور معمولی کپڑے۔"

انہوں نے میڈیکل باکس کھول کر چند ضروری چیزیں باہر نکالیں اور اس کا زخم صاف کرنے لگے تب ہی لڑکی کے لبوں سے ہلکی سی کراہ برآمد ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے۔ اس کی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں اور چہرے پہ تکلیف کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

"ہیلو آنکھیں کھولو بھئی میری آواز سن رہی ہو نا۔" اسے پوری طرح ہوش میں لانے کے لیے وہ اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے پکار رہے تھے۔ چند لمحے بعد لڑکی نے کرب آمیز کراہ کے ساتھ آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے لاشعوری طور پر اپنا ہاتھ اٹھا کر پیشانی کی طرف بڑھایا تھا' مگر دانیال حسن نے فوری طور پر اس کا ہاتھ تھام کر ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔

وہ لڑکی ایک آدھ سیکنڈ کے لیے غائب دماغی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ پھر جونہی اس کے لاشعور کا تعلق شعور سے جڑا تھا اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت اور پھر شدید قسم کا خوف ابھرا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے وہ برق رفتاری سے اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور صوفے سے نیچے اتر آئی تھی۔

"ارے' ارے۔" ایک لمحے کے لیے اسے بری طرح چکراتے دیکھ کر وہ بوکھلا گئے تھے۔ مگر لڑکی کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح اپنی سیاہ چادر کو سمیٹتے ہوئے ان سے دور ہٹتی چلی گئی تھی۔

"ارے کیا ہوا ہے تمہیں۔" اس اچانک اور شدید ردعمل نے انہیں بے حد حیران کر دیا تھا۔ لیکن لڑکی انہیں کسی بھی قسم کے سوال' جواب کا موقع دیے بغیر اپنی جگہ سے سرکی تھی اور پھر بھاگ کر ایک کمرے کے کھلے دروازے میں جا گھسی تھی۔

"او گاڈ۔" وہ حیران پریشان وہیل چیئر دھکیلتے اس کے پیچھے لپکے تھے' لیکن جب تک وہ وہاں پہنچے کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

"کمال ہے کہیں یہ لڑکی پاگل تو نہیں۔" متواتر دروازہ بجاتے ہوئے انہوں نے نہایت سنجیدگی سے سوچا۔

"خبردار دروازہ مت کھولنا' ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" وہ پوری قوت سے چلائی تھی۔

"بے وقوف لڑکی دروازہ کھولو' تمہارا سر زخمی ہوا اور تمہیں اس وقت مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔" انہوں نے قدرے خفگی سے کہا۔

"مجھے کمزور مت سمجھنا میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ میں' میں۔" اس کی بلند آواز یکلخت ہی ڈوب گئی تھی۔ دانیال حسن نے گھبرا کر کی ہول سے اندر جھانکا پھر چند لمحے دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود اس کی آواز نہ سنی تو وہ احمد کو پکارنے لگے۔ اس کمرے کی دوسری چابی منگوا کر وہ عجلت میں اندر داخل ہوئے تو وہ سامنے ہی فرش پہ ڈھیر نظر آئی۔ وہ سخت جھنجلا کر احمد کی طرف پلٹے۔

"ڈاکٹر عالیہ کے کلینک فون کر کے کسی نرس کو بلواؤ۔" اسے ہدایت دینے کے بعد وہ اس کے نزدیک آ گئے۔ قدرے جھک کر اسے سیدھا کرنے کے بعد وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئے تھے۔ ماتھے کے زخم سے دوبارہ خون جاری ہو گیا تھا۔ ہونٹ بے ہوشی کے عالم میں بھی ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ اس کی بے تحاشا زرد ہوتی رنگت نے انہیں مزید پریشان کر دیا تھا۔ جسم الگ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر عالیہ ایک زمانے میں ان کی کولیگ ہوا کرتی تھی۔ اس کا کلینک نزدیک ہی تھا لہٰذا نرس کے آنے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ تاہم اس کے آنے تک وہ بہتے ہوئے خون کو روکنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ نرس نے آتے ہی سب سے پہلے اسے بیڈ پہ شفٹ کیا تھا۔ پھر بڑی مہارت سے ماتھے پر پٹی کی تھی۔ چھلی ہوئی کہنی پر مرہم لگایا تھا اور سکون کا انجکشن دے کر چلی گئی تھی۔ بظاہر جسم پر کوئی اور زخم نہیں تھا اور اندرونی طور پر کسی چوٹ کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اگلی صبح تک اس کے اٹھنے کا کوئی امکان نہیں تھا'

اس لیے دانیال حسن دروازہ لاک کر کے اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔ کھانا کھانے تک وہ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ وہ کون ہے' کہاں سے آئی ہے' اس کے ماں' باپ کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ پھر اس کے عجیب و غریب طرز عمل نے انہیں مزید الجھا دیا تھا۔ عام طور پر ہوش میں آنے کے بعد کوئی بھی مریض خواہ وہ لڑکی ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کرتے جس طرح کہ اس لڑکی نے کیا تھا۔

"یا پھر ہو سکتا ہے کہ وہ مردوں سے کچھ زیادہ ہی خائف ہو اور ہوش میں آتے ہی مجھے دیکھ کر کچھ غلط سمجھ بیٹھی تھی۔" ان کے ذہن میں سونے سے قبل آخری سوچ یہی ابھری تھی۔

رات کے کسی پہر رضا کا فون آیا تھا اور وہ چھوٹتے ہی اس لڑکی کے بارے میں پوچھنے لگا تھا۔ انہوں نے جیسے تیسے اسے مطمئن کر کے ریسیور رکھ دیا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ خوامخواہ کی پریشانی ساتھ لیے پھرتا رہے۔

اگلی صبح بیدار ہوتے ہی انہیں سب سے پہلا خیال اس لڑکی کا آیا تھا۔ سو احمد کو ناشتہ بنانے کا کہہ کر وہ خود اس کے کمرے تک آ گئے تھے اب وہ فوراً اس لڑکی کا اتا پتا معلوم کرنا چاہ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا ایک رات گھر سے باہر رہنے کے بعد اس کے والدین پر کیا گزر رہی ہو گی۔ دروازے پر دستک دینے کے بعد انہوں نے کی ہول سے جھانکا وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے بیڈ سے نیچے اتر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ بری طرح چکرائی تھی اور پھر سنبھل کر کھڑی ہو گئی تھی۔ انہوں نے دوبارہ دستک دی مگر جواباً کوئی رسپانس نہیں ابھرا تھا۔ تنگ آ کر انہوں نے دوبارہ چابی سے کر دروازہ کھولا تھا۔

"اندر مت آنا' اندر مت آنا ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گی۔" نحیف آواز میں دی گئی دھمکی دانیال حسن پہ کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ دروازہ پوری طرح کھول کر وہیل چیئر گھسیٹتے ہوئے اندر داخل ہو گئے تھے۔

"خبردار وہیں رک جاؤ' آگے مت بڑھنا۔" وہ دیوار سے لگ کر خود کو سنبھالتے ہوئے گلدان اٹھائے کھڑی تھی۔

"دیکھو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم آرام سے بیٹھ کر میری بات سنو۔" انہوں نے بہت اپنائیت سے کہا تھا۔ لڑکی کا سرخ ہوتا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت بخار میں تپ رہی ہے۔

"نہیں تم فوراً اس کمرے سے چلے جاؤ۔" وہ ہسٹریائی کیفیت کا شکار نظر آ رہی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" انہوں نے اس کی ہدایت کو پوری طرح نظر انداز کر دیا تھا۔

"میں کچھ نہیں بتاؤں گی بس تم جاؤ یہاں سے۔" روہانسے انداز میں چلاتے ہوئے وہ انہیں ضرورت سے زیادہ خوفزدہ لگی تھی۔ نقاہت کے سبب وہ زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ پا رہی تھی اور غالباً اس کمزوری کا سامنا وہ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

"لڑکی! تم پہ یقیناً ہی نہیں' بے وقوف بھی ہو تمہیں اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ کل رات سے تم اس گھر میں ہو اور بالکل محفوظ ہو تمہیں کسی نے چھوا تک نہیں' پھر تم کس چیز سے اتنا خوفزدہ ہو رہی ہو۔" انہوں نے قدرے چڑ کر کہا۔ جواباً وہ لڑکی کچھ نہ کہہ پائی تھی بس تھکن سے نڈھال ہوتے ہوئے گلدان اس نے ہاتھ سے گرا دیا تھا اور خود دیوار کے ساتھ گھسٹتی ہوئی زمین پہ بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

دانیال حسن ایک طویل سانس لے کر رہ گئے تھے۔ تب ہی احمد ناشتے کی ٹرے لیے کمرے میں چلا آیا کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے حیرت بھری نظر سے بیٹھے روتی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور پھر دانیال حسن کو جو اچھے خاصے جھنجلائے ہوئے لگ رہے تھے۔ ان ہی کے اشارے پر وہ ٹرے میز پہ رکھ کر خود پلٹ گیا تھا۔

"اب پلیز رونا بند کرو۔ کل تم میرے چھوٹے بھائی

کی گاڑی سے ٹکرا گئی تھیں اس لیے وہ تمہیں یہاں لے آیا تھا۔ تم خوامخواہ اور ضرورت سے زیادہ پریشان ہو رہی ہو' رونے دھونے سے بہتر ہے کہ تم مجھے ٹھیک طرح سے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"میں کچھ نہیں بتاؤں گی' آپ خدا کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔" اس نے بری طرح روتے ہوئے سر اٹھایا تھا۔

"مگر کیوں۔۔۔؟"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے' ہر انسان سے خوف آ رہا ہے۔ آپ سے بھی آپ بس جائیں یہاں سے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے چکراتے ہوئے سر کو تھامے کہہ رہی تھی۔

"واٹ۔" اس کی آخری بات پر وہ بھڑک اٹھے تھے۔

"تمہیں مجھ سے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھ سے' ایک معذور شخص سے۔" معلوم نہیں انہیں اس کی حد سے بڑھی ہوئی بزدلی پر غصہ آیا تھا یا اس کے یہ جملے انہیں اپنے بے ضرر وجود پر تازیانہ محسوس ہوئے تھے۔

"کہیں تم پاگل تو نہیں ہو؟ کیا سمجھتی ہو تم کہ میں تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہوں؟ ہاں تم ایک ایسے شخص سے خوفزدہ ہو رہی ہو جو خود اپنے اوپر بوجھ ہے' جسے چند قدم آگے بڑھنے کے لیے ان بے جان پہیوں کا سہارا لینے کی ضرورت پڑتی ہے اور کیا تم خود کو اتنی کمزور سمجھتی ہو کہ تم ایک اپاہج انسان کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتیں۔۔۔؟" وہ غصے میں آئے تو بولتے چلے گئے۔

جبکہ وہ جواباً "کچھ نہیں بولی تھی بس ہچکیوں اور سسکیوں کی آواز کمرے کی خاموشی میں بلند ہوتی رہی تھی۔ تب انہیں اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔

"ہو سکتا ہے اس لڑکی کے ساتھ ایسا ہوا ہو کہ وہ۔۔۔" وہ چند لمحے اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے خود کو نارمل کرتے رہے' اور جب وہ دوبارہ اس سے مخاطب ہوئے تو آواز بہت دھیمی اور لہجہ نرمی لیے ہوئے تھا۔

"پلیز اب رونا بند کرو ورنہ تمہاری طبیعت مزید خراب ہو جائے گی۔ تم اطمینان سے ناشتہ کرو یہاں تم بالکل محفوظ ہو کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔" وہ کہہ کر کمرے سے باہر آ گئے تھے تب ہی احمد سیاہ رنگ کا [illegible] ہوا تھیلا لیے کمران کے پاس چلا آیا تھا۔

"یہ ڈرائنگ روم میں صوفے کے قریب رکھا تھا غالباً اسی لڑکی کا ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے میں دیکھ لیتا ہوں تم ایسا کرو کچھ دیر کے لیے گھر جا کر صغریٰ کو لے آؤ۔" انہوں نے احمد کی بیوی کا نام لیا اور خود تھیلے میں موجود چیزوں کا جائزہ لینے لگے تھے۔

"ایک عدد سوٹ چند سو روپے میٹرک کا رزلٹ کارڈ اور کارڈ سے منسلک ایک ایڈریس۔" ایڈریس دیکھ کر وہ حیران رہ گئے کیونکہ وہ ان ہی کے گھر کا ایڈریس تھا۔ وہ اس لڑکی سے اس پتے کی بابت جاننا چاہتے تھے مگر اس کی حالت کے پیش نظر فی الحال ارادہ ملتوی کر دیا۔ تب ہی احمد صغریٰ کے ساتھ واپس آ گیا تھا جو پہلے بھی گھر کی صفائی ستھرائی کے لیے آ جایا کرتی تھی۔

"یہ گولیاں لے جا کر اس لڑکی کو کھلا دو اور کپڑے بھی بدلوا دو۔" چائے کا سپ لیتے ہوئے انہوں نے میز پہ پڑی گولیوں کی طرف اشارہ کیا صغریٰ گولیاں اٹھا کر چلی گئی مگر جلد ہی واپس بھی آ گئی۔

"وہ تو ناشتہ کرنے پہ بھی آمادہ نہیں' گولیاں الگ اٹھا کر ایک طرف پھینک دیں۔ کہتی ہے نہ کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی۔"

"تو کیا مرنے کا ارادہ ہے اس کا۔" انہوں نے خفگی سے کہا تو وہ اپنی جگہ سٹپٹا کر رہ گئی۔

"میں کیا جانوں بھیا؟" اس نے فوراً کندھے اچکائے۔ دانیال حسن کے کڑے تیوروں سے ویسے بھی اس کی جان جاتی تھی۔

"اچھا تم چلو میں دیکھتا ہوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے کمرے کی جانب بڑھے۔

وہ کمرے میں داخل ہوئے تو صغریٰ اس کے پاس

بیٹھی اس کی منت سماجت میں مصروف تھی۔

"میں نے کہا نا میں کچھ نہیں کھاؤں گی' تم جاؤ یہاں سے۔" وہ ایک دم چیخی تھی۔ صغریٰ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دانیال حسن کو ایک دم غصہ آ گیا اگر معذوری حائل نہ ہوتی تو وہ اسی وقت اٹھ کر دو تھپڑ اس لڑکی کے لگاتے اور اس کے ہوش و حواس درست کر دیتے تاہم انہوں نے خود پر جبر کرتے ہوئے بہت عام سے انداز میں پوچھا۔

"ناشتہ کیوں نہیں کر رہی ہو تم۔۔۔؟" جواباً خاموشی چھائی رہی تھی۔

"دیکھو میں اس سے زیادہ تمہارے نخرے برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر تم ہم پہ بھروسا نہیں کر سکتیں تو ابھی اور اسی وقت اپنا پتا بتاؤ تاکہ ہم تمہیں وہاں پہنچا آئیں۔"

"نہیں۔" اس نے تڑپ کر التجائیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"نہیں' تو پھر ہم سے کو آپریٹ کرو' کچھ کھا پی کر میڈیسن لے لو تاکہ تمہاری طبیعت سنبھل جائے اور پھر بتاؤ تمہیں اپنے بارے میں کیونکہ میں نہیں جانتا تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ تمہارے وارث اگر تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ گئے تو مجھ پہ سیدھا سیدھا حبس بے جا کا مقدمہ کر دیں گے اور میں خوامخواہ کی مصیبت مول لینا نہیں چاہ رہا۔" انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔

"اور اگر تم ایسا نہیں کرو گی تو مجبوراً مجھے پولیس سے رابطہ کرنا پڑے گا پھر وہ تم سے جو بھی سلوک کریں گے اچھا یا برا میں ذمہ دار ہرگز نہیں ہوں گا۔" انہوں نے جان بوجھ کر سخت رویہ اختیار کیا تھا۔ تھیلے میں موجود سامان دیکھ کر کچھ نہ کچھ تسلی تو انہیں ہو ہی چکی تھی اور اس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد صغریٰ نے آ کر بتایا تھا کہ وہ ناشتے کے ساتھ گولیاں بھی کھا چکی ہے۔ انہوں نے قدرے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے صغریٰ کو شام کے وقت آنے کی تاکید کی اور پھر اپنے کمرے میں آ گئے۔ انہیں معلوم تھا اب وہ تین گھنٹے دوا کے زیر اثر سوتی رہے گی' اس لیے وہ اطمینان سے اس عرصے میں اپنے چند اہم کام نمٹا لینا چاہتے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس کی آنکھ کھلی تو نیم تاریک کمرے میں اے سی کی سرسراتی ٹھنڈک کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی اسے محسوس ہوا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا ہو۔ اس نے طویل سانس لے کر اپنی خالی اور ویران نگاہیں چھت پہ جما دی تھیں۔ تب ہی ہلکی سی کلک کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا۔ اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر دیکھنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی کسی نے لائٹ آن کر دی تھی۔ کمرہ سفید دودھیا روشنی سے بھر گیا تو اس کی آنکھیں ایک دم خیرہ سی ہو گئیں۔ اس نے فوراً روشنی سے بچنے کے لیے بازو اٹھا کر آنکھوں پہ رکھنا چاہا مگر پیشانی سے اٹھتی ٹیسوں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔

دانیال حسن نے اس کے قریب آتے ہوئے دیکھا اس کی زرد رنگت روشنی میں مزید نمایاں ہو گئی تھی اور وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے غالباً "تکلیف برداشت کرنے کی کوشش میں تھی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر اپنی طرف گھما کر پیشانی کا جائزہ لیا۔ آنکھوں پہ قدرے سوجن سی محسوس ہو رہی تھی پھر بھی انہیں امید تھی کہ چند روز تک زخم بھر جائے گا۔ بخار چیک کرنے کے لیے تھرمامیٹر اس کے منہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے نہایت پیشہ ورانہ انداز میں اس کی نبض دیکھنے کے لیے کلائی تھامی تو اس نے ہلکی سی جھرجھری لے کر آنکھیں پوری کی پوری کھول دی تھیں۔ غیر ارادی طور پر ہی اس نے اپنا بازو کھینچنا چاہا تھا مگر دانیال حسن کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ اس درجہ بے اختیاری پہ کئی سلوٹیں ایک ساتھ ان کے ماتھے پہ ابھری تھیں۔

"واضح رہے کہ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں۔" ان کا لہجہ خود بخود بے لحاظ ہو گیا تھا۔

"تمہارا بخار بھی تقریباً" ختم ہو چکا ہے۔" ذرا دیر بعد تھرمامیٹر نکالتے ہوئے انہوں نے بتایا۔

"تمہیں اندرونی طور پر تو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی۔۔۔؟"

"سارا وجود ہی درد میں ڈھل گیا ہے۔"

"کیا تم دوبارہ سونا چاہ رہی ہو۔۔۔؟" اسے آنکھیں میچے دیکھ کر انہوں نے پوچھا اور پھر جیسے مایوس ہو کر اس کی طرف سے پلٹے۔

"میرے پاس رہنے کے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں ہے میرا کوئی گھر اگر تھا بھی تو اب نہیں ہے۔"

اس کی آواز نیم جان سی بے بسی کا ادراک ہوا تھا' انہیں۔ بے اختیار پلٹ کر دیکھا اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"میری ماں اور میرے باپ نے ہم بہنوں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ انہوں نے بڑی آپا کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جسے بیوی سے زیادہ ایک ملازمہ کی ضرورت تھی۔ انہوں نے مینا آپی کو ایک ایسے بوڑھے سے بیاہ دیا جو اس کے باپ کی عمر سے بھی بڑا تھا۔ وہ نیہا کے ساتھ بھی یہ ہی کرتے صدف کے ساتھ بھی یہ ہی ہوتا تھا جیتے جی موت سے بدتر زندگی کا ذائقہ مجھے بھی چکھنا پڑتا اسی لیے میں اپنی استانی سے ان کی باجی کا پتہ لے کر گھر سے نکل آئی مگر ۔۔۔" اس نے دونوں ہاتھ سینے پہ رکھ لیے تھے اور آنکھیں بند تھیں اس کے باوجود دانیال حسن اس کی آنکھوں کے گوشوں میں ٹھہرے آنسوؤں کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔

"بہت اچھا ہو گا اس لڑکی کے لیے جو اگر یہ کھل کر رو دے۔۔۔" انہوں نے لمحے بھر کے لیے سوچا۔

"وہ سب سہ لینا آسان تھا۔ یہ دربدری' یہ پامالی یہ سب سہنا بہت مشکل ہے۔ بہت مشکل۔" وہ اپنی لال انگارہ آنکھیں کھول کر چھت کو تکنے لگی تھی۔

"یہ سب معلوم تھا پھر بھی تم اپنے اجلے پر لیے سیدھی سورج کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔" دانیال حسن کو اس تمام عرصے میں پہلی مرتبہ اس پہ ترس آیا تھا۔

"کوئی دوست رشتے دار احباب نہیں تھے جن کے پاس تم۔۔۔؟"

"کوئی نہیں تھا کوئی بھی نہیں اور اگر ہوتے بھی تو وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے دوبارہ اسی جہنم میں دھکیل آتے۔" آنسو ایک لکیر کی صورت اس کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

"وہ تمہارے اپنے تھے تمہیں جنم دینے والے تم ان سے اپنے لیے لڑ سکتی تھیں' اپنی بات منوا سکتی تھیں۔"

"نہیں اپنوں سے لڑنا آسان نہیں' جنم دینے والوں کے ساتھ لڑا نہیں جا سکتا' سر جھک جاتا ہے' زبان ساتھ نہیں دیتی' میں آپ سے لڑ سکتی ہوں ساری دنیا سے لڑ سکتی ہوں مگر اپنوں سے نہیں لڑ سکتی۔ انہیں چوٹ دینا' ان سے چوٹ کھانا' دونوں بہت اذیت ناک ہیں۔ آپ نہیں جانتے' اپنے مار دیتے ہیں۔ اپنوں کے دیے ہوئے دکھ مار دیتے ہیں۔ ان کے زہریلے رویے روح کا ناسور بن جاتے ہیں۔ ان کا ناروا سلوک دلوں کو کاٹ دیتا ہے' آپ کو نہیں معلوم یہ سب مگر میں جانتی ہوں اپنوں کی ماننا پڑتا ہے یا انہیں چھوڑنا پڑتا ہے اور ان دو راستوں کے بیچ کوئی تیسرا راستہ نہیں نکلتا' کوئی تیسرا راستہ نہیں نکلتا۔" ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو دی تھی۔

دانیال حسن چپ چاپ بیٹھے رہ گئے تھے۔ ان کے دل میں ہمدردی کے سوا کوئی اور جذبہ نہیں تھا اس لڑکی کے ہر رویے کی سمجھ انہیں اب آئی تھی۔ وہ کم عمر تھی کم سن تھی جذبات کی رو میں بہہ کر ایک انتہائی قدم اٹھا چکی تھی مگر اب تک بے یقینی کے عالم میں تھی۔

"مجھے استانی والا پتہ نہیں مل رہا تھا۔ آپ مجھے وہاں پہنچا دیں مگر میرا سامان ۔۔۔ اس میں وہ پتا تھا۔" وہ مزید متوحش ہو گئی۔

"کیا نام تھا تمہاری استانی کی بہن کا۔" وہ پتہ چونکہ ان ہی کے گھر کا تھا اس لیے انہوں نے پوچھا۔

"کیا نعیماں۔"

"نعیماں!" انہوں نے دہرایا' "مگر نعیماں تو ایک ماہ ہوا نوکری چھوڑ کر کسی دوسرے شہر چلی گئی ہے شاید 'صغریٰ!' انہوں نے صغریٰ کو پکارا۔ ادھر وہ حیران پریشان ان کی شکل دیکھ رہی تھی کہ یہ کیا نعیماں کو کیسے جانتے ہیں۔

"جی بھیا!" صغریٰ دوڑی آئی۔

"نعیماں کہاں گئی ہے کچھ پتا ہے؟"

"جی بھیا!" صغریٰ حیران تھی کہ صاحب کو اس وقت نعیماں کیسے یاد آ گئی۔ "بھیا! اس کے دیور کا بیٹا کراچی میں رہتا ہے۔ وہ اس کے پاس چلی گئی ہے۔"

"اچھا تم جاؤ" انہوں نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"تم جو پتہ ڈھونڈ رہی تھیں وہ میرے گھر کا ہے مگر اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ نعیماں یہاں نہیں ہے اب آئندہ کے لیے تمہیں کچھ تو سوچنا پڑے گا۔"

وہ یونہی چند لمحے بے تاثر انداز میں انہیں دیکھتی رہی' اور پھر اٹھ بیٹھی اپنے اوپر پڑا کمبل ہٹا کر وہ بیڈ سے نیچے اتری تھی اور ان کے قدموں کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ دانیال حسن الجھے الجھے سے اسے دیکھتے رہے۔ تب جیسے وہ سرگوشی کے عالم میں گویا ہوئی تھی۔

"آپ مجھے اپنے پاس رکھ لیں۔"

"میں۔۔۔؟" میں تمہیں یہاں کیسے رکھ سکتا ہوں؟" ایک لمحے کی حیرت پہ قابو پانے کے بعد وہ بہت سخت لہجے میں بولے تھے۔

"اس گھر میں کوئی عورت نہیں رہتی۔ اس صورت میں تمہیں یہاں رکھنا میرے لیے ناممکن ہے۔" انہوں نے واضح اور دو ٹوک انداز میں کہا تو وہ [illegible] اتر آئی۔

"کوئی تو ہو گا اس دنیا میں آپ کا' ماں' بہن' بیوی کسی کو یہاں بلا لیں نہیں تو میں اکیلی ہی دونوں کی ملازمہ بن کر صفائی ستھرائی' برتن' کپڑے میں ہر کام کر لیا کروں گی' مجھے بس رہنے کو ٹھکانہ دے دیں۔" وہ فقیرنی بنی بیٹھی تھی۔

"بیوقوف ہو تم اس گھر میں سارے مرد ملازم ہیں اور میں اپنے سوا کسی کی گارنٹی نہیں دے سکتا۔" وہ اس خواہ مخواہ کے مطالبے پر چڑ گئے تھے۔

"اور آپ کے بیوی بچے۔۔۔؟"

"میں نے شادی نہیں کی۔" ان کے سپاٹ لہجے پر اس نے بے ساختہ چونک کر انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ دانیال حسن چند لمحے اس کے اٹھنے کے منتظر رہے مگر جب کتنی ہی دیر تک اس کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو انہیں مجبوراً ٹوکنا پڑا۔

"میرا خیال ہے اب تم کچھ دیر آرام کرو۔ پھر کچھ سوچتے ہیں۔"

اس کا سر جوں کا توں جھکا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مراقبے میں بیٹھی ہو۔

"تم سن رہی ہو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔۔۔؟" انہوں نے اس کی گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھا جن میں یکلخت ہی بے تحاشا لرزش اتر آئی تھی تب اس نے سر اٹھا کر ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔

"آپ' آپ مجھ سے شادی کر لیں۔" اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ وہ بمشکل سن پائے تھے۔

"واٹ۔۔۔" وہ اپنی جگہ سے یوں اچھلے تھے گویا سانپ نے ڈس لیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔۔۔؟ تم ہوش میں تو ہو۔۔۔؟" حیرت کا پہاڑ ان پر ٹوٹا تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آپ مجھ سے شادی کر لیں۔ خدا کے لیے انکار مت کیجیے گا میں آپ کی بہت خدمت کروں گی۔ آپ کے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔ آپ۔۔۔"

"شٹ اپ' جسٹ شٹ اپ۔۔۔" وہ بری طرح دھاڑے۔ غصے اور جلال کی تیز لہر اٹھی تھی ان کے وجود میں۔

"تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے' اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں ابھی اور اسی وقت تمہیں اس گھر سے نکال

باہر کریں۔" ان کی سرد غراہٹ نے مقابل کے جسم میں سنسناہٹیں دوڑا دی تھیں۔

"پیچھے ہٹو تم۔" انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنی چیئر کے بازو سے ہٹائے تھے اور خود طیش کے عالم میں دروازے کی طرف چلے۔ لیکن ان سے پہلے ہی وہ برق رفتاری سے اٹھی۔ بھاگ کر دروازہ بند کیا اور اس سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی' اس کا پورا وجود ہچکیوں سے لرز رہا تھا اور آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اس وقت دانیال حسن کو زہر لگ رہا تھا۔

"ہٹ جاؤ سامنے سے۔" انہوں نے بری طرح ڈانٹا تھا مگر وہ وہیں اپنی جگہ زمین پہ بیٹھتی چلی گئی تھی۔

"میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گی۔ پلیز آپ میری بات مان لیں۔ آپ کو کسی سے تو شادی کرنی ہو گی نا تو پھر میں۔۔۔" اس نے اپنا چکراتا ہوا سر تھاما۔

"اگر تم میرے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتیں تو ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔" انہوں نے غصے سے لال انگارہ ہوتی آنکھوں سے اسے گھورا۔

"میں جانتی ہوں آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ میرا اعتبار کیجئے میں کسی آشنا کی محبت میں گرفتار ہو کر گھر سے نہیں بھاگی' میں نے فلموں ڈراموں میں ہیروئن بننے کے لیے گھر نہیں چھوڑا' میں کچھ بننا چاہتی تھی ایک ایسے مقام پر پہنچنا چاہتی تھی جہاں میں اپنے لیے' اپنے مظلوم بہنوں کے لیے کچھ کر سکتی۔ لیکن سب کچھ غلط ہو گیا۔ الٹ پلٹ ہو گیا۔ لیکن میں آج بھی پاکیزہ ہوں مجھے رہنے کے لیے صرف ایک چھت چاہیے۔ ایک آسرا چاہیے باہر کی دنیا بہت ظالم ہے۔ اگر آپ نے مجھے سہارا نہیں دیا تو میں ان ہی گلیوں میں رل جاؤں گی۔ دھول بن جاؤں گی۔ خدا کے لیے مجھے اپنا لیں خدا کے لیے۔" وہ ان کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے روتی چلی گئی تھی۔

اور دانیال حسن بت بنے اسے دیکھتے رہ گئے۔

♥ ♡ ♡ ♥

رات ساری آنکھوں میں کٹی تھی۔ ان کا دماغ پکے ہوئے پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ احمد ناشتہ لے کر ان کے کمرے میں آیا تو بے اختیار ان کی طبیعت کے متعلق پوچھنے لگا۔ چہرے پہ ایسی بیزار کن کیفیت کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ احمد کو ٹال کر انہوں نے برائے نام ناشتہ کیا۔ گزشتہ روز اس نادان لڑکی کی کہی گئی باتیں پوری رات سماعتوں میں گونجتی رہی تھیں اور اس وقت انہیں اس لڑکی سے زیادہ خود پہ غصہ آ رہا تھا کہ کل جو بات انہیں ناممکنات میں سے لگ رہی تھی آج ممکن ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

"کیوں کروں میں اس لڑکی سے شادی' جس کے نام تک سے میں ناواقف ہوں۔" وہ اپنی کیفیت پر چڑ گئے تھے۔

یہ حقیقت تھی کہ رات کو خالی کمرے میں انہیں اپنی زندگی کی ویرانی اور تنہائی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی' کتنی لڑکیاں تھیں' جو وجیہہ و جمیل دانیال حسن پر جان چھڑکتی تھیں' لیکن پھر ایک حادثہ ہوا اور ان کے کمرے کے گلدانوں میں رکھے پھول خشک ہو کر بکھر گئے۔ موسم بدلتے رہے مگر ان کے نام تازہ مہکتے پھولوں کا گلدستہ کبھی نہ آیا۔

"اور میں بھی ایک بہت خوشحال زندگی گزار رہا ہوتا جو اگر یہ حادثہ نہ ہوتا۔" محرومی کا احساس شدت اختیار کر گیا تھا۔ لیکن اب دن کے اجالے میں وہ سب ایک بار پھر ناممکن لگنے لگا تھا۔

"دوست احباب کیا سوچیں گے؟ میں ایک لڑکی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ساری عمر کے لیے اس پر بوجھ بن گیا۔" انہوں نے سوچا تھا کہ وہ ابھی اور اسی وقت اس لڑکی کو یہاں سے چلتا کریں گے۔

"احمد! اس لڑکی کو بلا کر لاؤ یہاں۔۔۔" انہوں نے احمد کو ہدایت کی اور کچھ ہی دیر بعد وہ ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی کسی مجرم کی طرح سر جھکائے۔

"دماغ درست ہوا یا چوٹ کا اثر ابھی بھی باقی ہے۔" اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"کل میں نے جو کچھ بھی کہا تھا پورے ہوش و حواس میں کہا تھا۔" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے بیٹھی تھی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک جذباتی لڑکی ہو' ایک غلط فیصلہ پہلے کر چکی ہو اور دوسرا اب کرنے جا رہی ہو۔"

اس نے سر اٹھا کر غالباً ان کی بات سے اختلاف کرنا چاہا تھا مگر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا تھا۔

"تم نے میری اور اپنی عمروں کے درمیان فرق کو دیکھا ہے۔ اگلے سال میں پورے چالیس برس کا ہو جاؤں گا اور تم کتنی عمر ہو گی تمہاری زیادہ سے زیادہ سترہ سال اٹھارہ یا انیس سال گزار سکو گی پوری زندگی ایک اپاہج اور معذور انسان کے ساتھ یہ وہیل چیئر یہ محرومی کیا سمجھتی ہو تم ان سب کو کوئی ڈرامہ کوئی کھیل یا مذاق؟ یہ ایک حقیقت ہے ایک اٹل حقیقت آج جذباتیت میں تم میری محرومی کو گلے سے لگانے کے لیے تیار ہو' لیکن چند سال بعد جب آنکھوں سے اس جذباتیت کا پردہ اٹھے گا تو۔۔۔؟ کیسے سہارا دو گی تم اس بوجھ کو آج تمہیں میرا سہارا چاہیے' میرا آسرا درکار ہے لیکن کل یہ ادھورا وجود تمہارے لیے قابل نفرت بن جائے گا پھر تم کیا کرو گی ہاں۔۔۔" وہ بے حد تلخ ہو گئے تھے۔

"تم ابھی معصوم ہو' کم عمر ہو لیکن میں جانتا ہوں کہ کل کو کیا ہو گا' لوگ تبصرہ کریں گے مجھ پہ اور ترس کھایا کریں گے تم پہ زندگی میں زہر بھر جائے گا کچھ اور تلخ کچھ اور کڑوی ہو جائے گی یہ زندگی' تم نے بہت غلط چاہا ہے میرے لیے۔" وہ جیسے تھک کر خاموش ہو گئے تھے۔ تب اس نے آہستگی سے سر اٹھایا تھا۔

"میں نے آپ کے لیے نہیں اپنے لیے سوچا ہے اور میں اس وقت اس سے بہتر اور کچھ نہیں سوچ سکتی۔" اس نے رکتے' جھجکتے ہوئے کہہ ڈالا تھا۔

"مذاق سمجھ رکھا ہے عمر بھر کا معاملہ ہے یہ۔" وہ اس کی ڈھٹائی پر چڑ گئے تھے۔ در حقیقت اپنی کمزوری پر۔ "آخر میں اس لڑکی سے سیدھے سبھاؤ یہ کیوں نہیں کہہ رہا کہ جاؤ یہاں سے اور اپنی شکل گم کرو" انہوں نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

"میں بالکل سنجیدہ ہوں۔" انہوں نے اسے کہتے سنا اور سن کر خاموش ہو بیٹھے تھے۔

"مان لو دانیال حسن اگر تمہاری اس تاحیات محرومی کے بعد کوئی لڑکی بھی تمہارے قریب نہیں پھٹکے گی۔ تو پھر تم اپنا یہ واحد اور آخری سہارا کھونے پر بھی کیوں تیار ہو۔۔۔؟ اسے ایک چھت کی ضرورت ہے اور تمہیں ایک گھر کی اور گھر بھی عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوا کرتا۔" کوئی انہیں اندر سے آمادہ کر رہا تھا' انہوں نے قدرے الجھ کر اسے دیکھا۔ وہ جیسے دم سادھے فیصلے کی منتظر تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہوں' مگر تمہیں وعدہ کرنا ہو گا کہ اس تعلق کا ہمارے چند ایک دوستوں کے سوا کسی کو علم نہیں ہو گا کسی کو بھی نہیں اور جن کے علم میں یہ بات آئے گی وہ بھی صرف وہ لوگ ہوں گے جو ہمارے نکاح میں شریک ہوں گے رائٹ۔ میں تمہارے لیے واپسی کا ہر راستہ کھلا رکھنا چاہتا ہوں۔"

ان کی بات کے جواب میں اس نے ایک بے یقین سی نظر ان پہ ڈالی تھی اور پھر طویل سانس لے کر سر جھکا دیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

میں نے کہیں پڑھا تھا۔
محبت ایک دریا ہے۔
جو بے آب و گیاہ اجسام کو سیراب کرتا ہے۔
سدا معمور رہتا ہے۔

لیکن نجانے وہ دریا کیسا تھا کہ جس کے کنارے اپنی عمر کے سترہ سال گزارنے کے باوجود میری تشنہ لبی جوں کی توں برقرار ہے۔ میں نے جب جب بھی اس دریا سے اپنی پیاس کو تر کرنا چاہا یہ لق و دق صحرا میں بدل گیا' جہاں حد نظر ریت ہی ریت تھی۔ نفرت آمیز زہریلے رویوں کی ریت جسے پھانک پھانک کر میرے

حلق تک ریت ہی ریت بھر گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا الزام کسے دوں۔۔۔؟

اپنی کم نصیبی کو یا بدقسمتی کو کہ اس دریا کا ایک قطرہ بھی ایسا نہیں تھا جس پر میرا نام لکھا ہو صرف میرا میری کھوج' میری جستجو' میری تمنا نے محبت کے اس دریا کو کھنگال ڈالا' تب کہیں جا کر معلوم ہوا کہ یہ پورے کا پورا دریا کسی اور کے لیے تھا۔ حقدار ہوتے ہوئے بھی مجھے محروم رکھا گیا تھا معلوم نہیں کیوں؟ ماضی کی تختی نکال کر سامنے رکھوں تو ہر سطر میں بیسیوں سوالیہ نشان میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں جو ابتدائی سطروں میں بہت ننھے منے ہیں مگر رفتہ رفتہ ان کے حجم میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے اور میں شدت سے اس دن کی منتظر ہوں جب۔۔۔"

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی' اور وہ ڈائری لکھتے ہوئے بری طرح چونک گئی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی۔" دانیال حسن اندر داخل ہوئے تو اس نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔

"کچھ نہیں بس ڈائری لکھ رہی تھی۔"

"ہمیں بھی تو معلوم ہو کیا لکھا جا رہا ہے۔" انہوں نے سرسری سے انداز میں پوچھا تھا اور در نجف نے یونہی کھلی ڈائری ان کی طرف بڑھا دی تھی۔ اس وجہ اعتماد اور مان نے ان کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیلا دی تھی۔ ڈائری اس کے ہاتھ سے لے کر بند کر کے میز پہ رکھتے ہوئے وہ اس کی طرف پلٹے تھے۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔" وہ بڑی بڑی آنکھوں میں سوال لیے انہیں دیکھنے لگی۔

"تمہارا میڈیکل میں ایڈمیشن ہو گیا ہے۔"

"سچ۔۔۔؟" اس کے چہرے پہ لوٹ آنے والے بے ساختہ خوشی کے تاثرات کو انہوں نے بڑی محویت سے دیکھا تھا۔

"ہاں' بالکل سچ میں نے ٹائمنگ وغیرہ سب معلوم کروائی ہے۔ کلاسز کچھ دن بعد شروع ہوں گی لیکن بہتر ہو گا تم ابھی سے پڑھائی شروع کر دو اور کیا خیال ہے اسی خوشی میں ہم باہر کھانا کھانے چلیں۔۔۔؟"

وہ جو بہت دھیان سے ان کی باتیں سننے لگی تھی آخری بات سن کر ایک دم چونک گئی تھی۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے حسب عادت اور حسب توقع جواب دیا تھا۔

"میں تمہاری مرضی پوچھ رہا ہوں۔" انہیں ان تین الفاظ سے سخت چڑ تھی۔

"میرا خیال ہے گھر میں ہی ٹھیک رہے گا۔ آپ جو کھانا چاہ رہے ہیں بتا دیں میں بنا لوں گی۔"

"چائنیز بنا لوں گی۔۔۔؟" ان کے سنجیدگی سے کہنے پر وہ سر جھکا کر ہتھیلیاں مسلنے لگی تھی' تب وہ شگفتہ انداز میں مسکرا دیے تھے۔

"او کے بھئی گھر میں ہی ٹھیک ہے۔ جو تم چاہو بنا لو۔"

"اگر آپ کا دل چاہ رہا ہے تب۔۔۔؟"

"نہیں پھر کبھی چلیں گے' جب تمہارا موڈ ہو گا۔۔۔" وہ اس کا ارادہ بھانپ گئے تھے اس لیے مزید اصرار کیے بغیر اس کے کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ وہ یونہی کرتے تھے ہمیشہ اس کی پسند ناپسند کا علم ہو جاتا تو پھر ہر عمل اس کے مطابق ڈھال دیتے اور پھر حیران ہونے لگتے۔

کتنا چاہنے لگے تھے وہ اسے ان دو سالوں میں وہ؟ ایک عام سی لڑکی تھی ہر گزرتے دن کے ساتھ بہت خاص بنتی چلی گئی تھی ان کے لیے۔ اس کا ہنسنا' اس کا بولنا' اس کی خوشیاں' اس کے دکھ کس قدر اہم ہو گئے تھے۔ وہ اداس ہوتی تو دانیال حسن خود بخود بے چین ہو جاتے اس کی آنکھ میں آنسو دیکھ لیتے تو رات بھر سو نہ پاتے۔ انہوں نے ذرہ ذرہ سمیٹ لیا تھا اسے اس کی شخصیت کے ہر خلا کو بھرنے کے لیے اپنی ساری کوششیں صرف کر ڈالی تھیں۔ ابتدائی دنوں میں وہ کس قدر ڈسٹرب رہا کرتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے چونک جاتی۔ بات کرتے کرتے بلاوجہ ہی رو دیتی۔

جب وہ ذرا سنبھلی تو انہوں نے اسے کالج میں ایڈمیشن دلا دیا۔ وہ کتاب سامنے رکھے نجانے کن سوچوں میں

الجھی رہتی تب انہوں نے اس کی پڑھائی کا ذمہ بھی اپنے سر لے لیا۔ وہ گھنٹوں اسے اپنے پاس بٹھا کر ایک ایک چیز سمجھاتے۔ وہ بھی بہت دھیان سے سنتی اور کبھی بے خبری میں ان کا چہرہ تکنے لگتی۔ تب وہ اسے ہلکا سا ڈانٹ دیتے اور وہ چپ چاپ آنکھیں جھپک جھپک کر آنسو پیتے ہوئے ان کی ساری باتیں سن لیتی۔ ان ہی کی بدولت ایف ایس سی میں اس نے نمایاں پوزیشن لی تھی اور اب میڈیکل کی پڑھائی کے لیے بھی تو وہ مطمئن تھی کہ دانیال حسن خود ایک کامیاب ڈاکٹر تھے اور ایک بہترین استاد ہوتے ہوئے اسے پریشان ہونے کی ضرورت بھی کیا تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا تھا' اور در نجف اتنی تیزی میں اندر داخل ہوئی تھی گویا سارا شہر اس کے پیچھے لگا ہو۔ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف دانیال حسن نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر بری طرح چونک گئے زرد چہرہ' اڑی ہوئی رنگت' پیشانی سے پھوٹتا پسینہ' بیگ صوفے پہ پھینک کر وہ خود بھی بے دم سے انداز میں صوفے پہ گر سی گئی تو وہ گھبرا گئے آج میڈیکل کالج میں اس کا پہلا دن تھا۔ صبح وہ خود ڈرائیور کے ساتھ اسے کالج چھوڑنے گئے تھے اور اس وقت تک بالکل ٹھیک ٹھاک تھی پھر اب۔۔۔

"کیا ہوا۔۔۔؟" انہوں نے قریب آتے ہوئے پوچھا تھا اور وہ یوں چونکی تھی گویا ان کی وہاں موجودگی سے بے خبر ہو۔

"آر یو آل رائیٹ۔" انہوں نے اس کی ٹھنڈی پیشانی کو چھوا۔ جواب اب بھی ندارد تھا۔

"در نجف کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔؟"

"کچھ نہیں۔" ان کے بے چینی سے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیا مطلب کچھ نہیں؟ حالت دیکھ رہی ہو تم اپنی۔" انہوں نے قدرے ناراضی سے اسے صوفے کی پشت پہ سر گراتے دیکھا اور پھر آواز لگا کر احمد کو پانی یا ریفریش لانے کا کہا۔

"ہاں اب بولو۔" وہ اس کی طرف پلٹے تو اسے معلوم ہو گیا کہ اب یہ اصل بات اگلوا کر ہی رہیں گے۔

تب جیسے مجبوراً" بتانا پڑا تھا اسے۔ ڈرائیور آدھا گھنٹہ لیٹ ہو گیا تھا وہ پریشان ہو کر سڑک پہ نکل آئی۔ وہیں ایک کار والے نے اسے لفٹ کی آفر کر دی اور وہ اتنا گھبرائی کہ سامنے سے آتی غلط روٹ کی بس پہ سوار ہو گئی۔ یہ بات کسی اور سمت بس کو جاتا دیکھ کر معلوم ہوئی۔ وہاں سے بڑی ہمت کے ساتھ دوسری بس پکڑی اور اب وہ اسٹاپ سے گھر تک پیدل آ رہی تھی۔

گرمی' دھوپ اور ذہنی تناؤ' نتیجتاً بی پی لو اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

دانیال حسن نے بی پی آپریٹس میز پر تقریباً پھینکا تھا۔ اس نے ہلکی سی جھرجھری لے کر ذرا سی آنکھیں کھولیں۔ چہرے کے تاثرات سے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اب ڈانٹ پڑ کے رہے گی۔

"سیدھی ہو کر بیٹھو۔۔۔" وہ صوفے پہ ایک طرف لڑھکنے کو تھی جب انہوں نے بری طرح ڈپٹ دیا۔ اس نے دانتوں تلے ہونٹ دبا لیا۔ تب انہوں نے اسے گھورتے ہوئے گلوکوز ملا پانی اس کی طرف بڑھایا۔

"تم مجھے بہت مایوس کر رہی ہو در نجف۔ میں تمہیں جتنا بہادر بنانے کی کوشش کرتا ہوں تم بعض اوقات اتنی ہی بزدلی کا مظاہرہ کر جاتی ہو۔" ان کی بات سن کر اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"ڈرائیور لیٹ ہو گیا تھا تو بھی کالج سے باہر نکلنے کی کیا تک تھی۔ چلو نکل بھی آئی تھیں' کسی نے لفٹ کی آفر بھی کر دی تھی تو کیا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس شہر کی سڑکوں پر بیسیوں لوگ ہیں جو بیسیوں لڑکیوں کو لفٹ کی آفر کرتے ہیں پھر اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات تھی کہ تم ایک غلط بس پہ سوار ہو گئیں۔" وہ حسب توقع شروع ہو چکے تھے۔

"تم گھر سے نکلتی ہی اس خوفزدہ انداز میں ہو کہ گیدڑ بھی تمہارے سامنے شیر ہو جائیں' ہر کوئی

تمہیں میٹھی گولی کی طرح اپنے منہ میں رکھ کر نگل لینا چاہتا ہے۔ تم کیوں ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح بی ہیو کرتی ہو کہ ہر کوئی تمہیں چیل کوے کی طرح دبوچنے کے لیے تیار ہو جائے۔ یاد رکھو اگر ایک عورت کو گھر سے باہر نکلنا ہو تو اسے ہمت، حوصلے اور اعتماد کے ہتھیاروں سے لیس ہونا پڑتا ہے۔ تم اپنی شخصیت میں بے خوفی کو جگہ دو۔ اپنی ہاتھوں میں اعتماد کے ایسے خنجر پکڑ لو کہ جن سے تمہارے سامنے آنے والا ہر فرد گھائل ہو سکے۔ اپنی حرکات و سکنات میں جرات کا مظاہرہ کرو۔ یہ راہ چلتے لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایک فرد اگر تمہیں تنگ کر رہا ہے تو تمہاری ایک آواز پر بیسیوں لوگ تمہاری مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن کوشش کرو نجف کہ تمہیں مدد لینے کے لیے دوسروں کو پکارنا نہ پڑے۔ اپنی شخصیت کو اتنا مضبوط بنا لو، اتنا مستحکم کر لو کہ عام انسان تم سے بات کرنے سے پہلے ہزار بار سوچے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات۔"

اسے خاموش بیٹھے دیکھ کر انہوں نے اچانک ہی پوچھا تو اس نے طویل سانس لے کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے، اب تم جا کر آرام کرو۔" اس کا اترا چہرہ دیکھ کر انہوں نے کہا تو وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ رات کو کھانے کے بعد وہ حسب معمول پڑھنے کے لیے ان کے کمرے میں نہیں آئی تو انہیں مجبوراً ملازم سے کہہ کر اسے بلوانا پڑا۔ کافی دیر بعد وہ کتابیں اٹھائے کمرے میں بڑی خاموشی سے داخل ہوئی اور میز پہ کتابیں رکھ کر وہیں کارپٹ پہ کشن کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"آج پڑھنے کا ارادہ نہیں تھا کیا؟" کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے بیٹھے انہوں نے مصروف سے انداز میں پوچھا تھا۔ جواباً خاموشی چھائی رہی تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ خفا خفا سے انداز میں کتابیں کھولنے لگی تھی۔

"ناراض ہو؟" انہوں نے اندازہ لگایا اور توقع کے برعکس اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا تب وہ کمپیوٹر آف کرتے ہوئے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کیوں بھلا؟"

"دوپہر میں آپ نے اتنا ڈانٹا مجھے۔ میری خراب طبیعت کی بھی پروا نہیں کی۔" یہ شکایتی انداز ان کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ زیرلب مسکرا دیے۔

"شکر کرو، صرف ڈانٹا تھا، مارا نہیں۔"

"تو کیا ہوا، آئندہ کسر پوری کر لیجیے گا۔" اس کے جلے بھنے انداز پر وہ بے اختیار ہنس دیے تھے۔

"پاگل لڑکی! میں تمہاری شخصیت کو مکمل اور بھرپور بنانا چاہتا ہوں، ایک دم پرفیکٹ۔ یہ رونا دھونا، یہ بزدلی، ڈر خوف یہ سب چیزیں مجھے زہر لگتی ہیں۔ میں تمہیں بہت طاقت ور دیکھنا چاہتا ہوں۔ باہمت، باحوصلہ اور نڈر لڑکی کے روپ میں۔" ان کی خواہش کے بے ساختہ اظہار پر وہ سر جھٹک کر مسکرا دی تھی۔

"پہلے میں ایسی ہی ہوا کرتی تھی، کسی کی پروا نہ کرنے والی۔ جب میں اپنے گھر میں تھی تب۔" وہ بری طرح چونک گئے (تو کیا یہ ابھی تک اس گھر کو 'اپنا' تسلیم نہیں کر سکی) وہ ان کی سوچ سے بے نیاز اپنی کہے جا رہی تھی۔

"میں پیدل اسکول جایا کرتی تھی۔ مگر اس کے باوجود محلے کے کسی لڑکے میں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ کبھی میرا راستہ روک سکتا۔ مجھ میں اتنی جرات ہوتی تھی کہ خود پر کوئی فقرہ کسنے والے کا منہ توڑ سکوں۔ گھر سے اسکول تک کا فاصلہ میں بہت محتاط ہو کر طے کرتی تھی۔ اس کے باوجود عظیم"

ماضی کا کوئی تکلیف دہ لمحہ اس کی آنکھوں میں نمی بھر گیا تھا۔ اور دانیال حسن جو ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے پر اترتے غم کے سایوں کو دیکھ رہے تھے، اس لمحے ان کا دل چاہا تھا کہ وہ اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیں۔ اس کے سارے آنسو اپنی پوروں پر سمیٹ لیں، اور کہیں "سنو! تم رویا مت کرو، تمہارے آنسو میرے دل پہ گرتے ہیں۔"

مگر وہ اپنی جگہ بت بنے بیٹھے رہے تھے اور در نجف

اپنی آنکھیں خود ہی مسلنے لگی تھی۔ انہوں نے بھلا کب بھی اپنا استحقاق استعمال کیا تھا وہ تو بہت محتاط ہو کر زندگی گزار رہے تھے۔

"اور بھی جو اس کو واپسی کا راستہ طے کرنا ہو تو کوئی زنجیر ایسی نہیں ہونی چاہیے جو اسے باندھ کر یہاں رکنے پر مجبور کر دے۔" انہوں نے فیصلہ کر رکھا تھا۔

اور اس کے بعد وہ دونوں بہت دیر تک گم صم رہے تھے۔ در نجف ماضی کی تکلیف دہ یادوں میں کھوئی رہی اور وہ مستقبل کے اندیشوں میں لرزتے رہے۔ وہ غائب دماغی سے پڑھاتے رہے۔ نجف بے توجہی سے سنتی رہی۔ دیوار پر لگی گھڑی نے گیارہ کا گھنٹہ بجایا تو انہوں نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی۔

"میرا خیال ہے آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

"ہوں۔" وہ یونہی اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی۔ دانیال حسن وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے دوبارہ کمپیوٹر کے سامنے آ بیٹھے۔ کتنی ہی دیر تک اسکرین پر نظریں جمائے رکھنے اور کی بورڈ پہ انگلیاں چلانے کے باوجود در نجف کے کمرے میں موجودگی انہیں ڈسٹرب کرتی رہی تھی۔ تب وہ کام روک کر اس کی طرف پلٹے۔

وہ میز پر کہنی ٹکائے، بند مٹھی پہ چہرہ ٹکائے نجانے کب سے انہیں خمار آلود آنکھوں سے تکے جا رہی تھی۔ نظریں چار ہوئیں تو اس نے ایک دم پلکیں جھکا لیں۔

"سونے کا ارادہ نہیں کیا؟" انہوں نے جان بوجھ کر کوئی رسپانس نہیں دیا۔

"جا رہی ہوں۔" دانیال حسن کو اس کے انداز میں بے دلی سی محسوس ہوئی تھی۔

"آج میری کچھ کلاس فیلوز نے آپ کو میرے ساتھ دیکھا تھا۔ پوچھ رہی تھیں آپ کے بارے میں۔" وہ جاتے جاتے ادھ کھلے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں نے کہا میرے کزن ہیں، بہت تعریف کر رہی تھیں آپ کی۔"

"اچھا۔" انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

"گریس فل... سوبر، وجیہہ اور نجانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔" وہ ہلکا سا ہنسی تب انہوں نے پلٹ کر بغور اسے دیکھا۔ سنہری بالوں کی چھوٹی چھوٹی گھنگھریالی لٹیں اس کے صبیح چہرے کو چھو رہی تھیں۔ لبوں پر الوہی سی مسکراہٹ، وہ نظریں جھکائے پاؤں کے انگوٹھے سے قالین پر نادیدہ لکیریں کھینچ رہی تھی۔ نجانے کیوں انہیں اس کے انداز بدلے سے محسوس ہوئے تھے۔

"ہاں، جب میں وہیل چیئر پہ نہ بیٹھا ہوں تو ایسا ہی لگتا ہوں۔" دانستہ یا نادانستہ وہ دل میں چھپی محرومی کا اظہار کر گئے تھے۔ در نجف نے تڑپ کر انہیں دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ ان کی کہی گئی بات کی مخالفت کرتی وہ بول اٹھے تھے۔

"بہرحال تم نے کیا کہا؟"

اس نے اپنی سیاہ آنکھیں کھول کر ایک بھرپور نظر ان پر ڈالی۔

"میں نے کہا، وہ جتنے اچھے دکھائی دیتے ہیں، درحقیقت اس سے زیادہ اچھے ہیں۔" بڑے اطمینان سے کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی پلٹ گئی تھی اور دانیال حسن بہت دیر تک اس ایک مسکراہٹ میں الجھے رہے تھے۔

♥ ▽ ▽ ♥

وہ میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں تھی۔ جب ایک روز دانیال حسن اسے ساتھ لے کر "ضیاء حسن ہاسپٹل" کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

"یہ چھوٹا سا ہاسپٹل ڈیڈی نے میرے لیے بنوایا تھا۔ وہ خود بھی ایک معروف سرجن تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم دونوں اسی ہاسپٹل میں کام کریں اور ہم نے کیا بھی۔ تقریباً پانچ سال تک اور پھر یہ حادثہ ہو گیا۔ ہماری گاڑی ایک ٹرالر کے ساتھ ٹکرا گئی۔ اس حادثے نے میرے ماں باپ کو مجھ سے چھین لیا اور عمر بھر کی معذوری مجھے سونپ دی۔ اس کے بعد میں نے کئی بار یہاں آ کر کام کرنے کی کوشش کی مگر اپنے ہی مریضوں کی ترحم آمیز نظروں کا سامنا کرنا میرے لیے

بہت مشکل تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر افتخار نے اسے خریدنا چاہا مگر میں راضی نہ ہوا۔ اب یہ ہاسپٹل اور کلاٹ ہمارے ہیں جب کہ اسٹاف ڈاکٹر افتخار کا ہے۔" ان کے لہجے سے یاسیت آمیز اداسی جھلک رہی تھی۔

"اور رضا۔۔۔؟ کیا وہ یہاں آپ دونوں کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"وہ بچپن سے ہی امریکہ میں ماموں کے پاس رہا ہے۔ وہ کبھی مستقل طور پر یہاں نہیں آئے گا۔" دانیال حسن کی نگاہیں ہاسپٹل پر جمی ہوئی تھیں۔ اور نمی ان کی آنکھوں میں بڑھتی جا رہی تھی۔ در نجف کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

"تمہیں جب بھی وقت ملے تو یہاں آجایا کرو۔ یہ کتابیں اور لفظ اس وقت تک کھوکھلے اور بے رنگ ہیں جب تک ان میں تجربے کا رنگ شامل نہ ہو۔" دانیال حسن نے دانستہ موضوع بدلا تھا۔

"میں یہاں ضرور آؤں گی دانیال حسن! اور ایک روز آپ کو بھی گھر کے کونے سے نکال کر اس ہاسپٹل کے اندر لا کر کھڑا کروں گی۔ اور پھر ہم دونوں۔۔۔" وہ خیالوں ہی خیالوں میں دانیال حسن کے ہم قدم اس ہاسپٹل کی راہداریوں میں پھرنے لگی تھی۔

اور پھر فائنل ایر کے بعد وہ مستقل طور پر یہاں آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر افتخار کے بیٹے ڈاکٹر علی، دانیال حسن کے ایک فون پر اس سے اس حد تک کو تعاون کرنے لگے تھے کہ کچھ عرصے میں ہی اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اس تجربے نے اس کی شخصیت کی تعمیر میں بہت مثبت کردار ادا کیا تھا، دنوں میں ان گنت لوگوں سے ملنے کے بعد وہ بے پناہ پُراعتماد نظر آنے لگی تھی۔

اور ان ہی دنوں اس کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا تھا۔ سب سے ٹاپ پر اپنا رول نمبر دیکھ کر دیوانوں کی طرح بھاگتی ہوئی دانیال حسن کے کمرے میں گھس گئی تھی۔

"دانیال حسن۔۔۔ دیکھیں میرا رزلٹ آگیا ہے۔ میں ڈاکٹر بن گئی ہوں، میں نے منزل پالی ہے۔" وہ ہنستے ہنستے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں اس مقام پر پہنچ گئی ہوں، جس کے میں نے دن رات خواب دیکھے تھے۔ ایک ایک گھڑی ایک ایک لمحہ گن گن کر گزارا ہے میں نے۔۔۔ صرف اس دن کے لیے اب مجھے اپنے فیصلے پر کوئی پشیمانی نہیں اب میں سر اٹھا کر ان لوگوں کا سامنا کر سکوں گی۔ میں انہیں بتاؤں گی کہ در نجف اتنی کمتر نہیں تھی۔ وہ کھوٹا سکہ نہیں تھی۔ اس کی اپنی ایک شخصیت تھی اپنا وجود تھا جسے انہوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں ثابت کر کے رہوں گی۔ میں ڈاکٹر در نجف، جس کو پڑھانے کے لیے ان کے پاس فیس نہیں تھی۔ جس کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ان کے پاس "فالتو روپے" نہیں تھے۔ میں بتاؤں گی انہیں دانیال حسن! کہ در نجف اتنی ارزاں نہیں تھی۔" وہ ان کا ہاتھ تھامے رو رو کر گھائل لہجے میں بولتی چلی گئی تھی۔ اور انہوں نے جان بوجھ کر اسے کھل کے رونے دیا تھا۔

اور اسی رات وہ ان کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"میں اماں! ابا کے پاس جانا چاہتی ہوں! دانیال حسن میں کب جاؤں۔۔۔؟"

اور ان کا دل ایک لمحے کے لیے کانپ گیا۔ "تو کیا ہم اس دوراہے پر آ پہنچے ہیں، جہاں ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے۔" وہ فوری طور پر اسے کوئی جواب نہ دے پائے تھے۔

"بتائیں ناں کب جاؤں؟"

"(کبھی مت جانا) انہوں نے کلائی پہ بندھی گھڑی اتار کر ہاتھ میں لیتے ہوئے وقت دیکھا اور نجف منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

"آج ڈاکٹر علی کا فون آیا تھا۔"

"تو۔۔۔؟" در نجف کو حیرت ہوئی۔ وہ اکثر و بیشتر یہاں فون کرتا رہتا تھا پھر آج کیا نئی بات تھی۔ جواباً انہوں نے گھڑی دوبارہ کلائی پر چڑھائی تھی اور وہیل چیئر کو حرکت دیتے ہوئے اپنا رخ کھڑکی کی طرف موڑ لیا تھا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولے تھے۔

"وہ تمہیں میری کزن کی حیثیت سے جانتا ہے۔" در نجف سمجھ نہیں پائی وہ اسے بتا رہے تھے یا پوچھ رہے تھے۔

تاہم اس نے اثبات میں جواب دے دیا تھا۔

"در نجف! ڈاکٹر علی تمہیں پرپوز کرنا چاہتا ہے۔" انہوں نے گویا زہر میں بجھا ایک تیر اس کی طرف اچھالا تھا۔ وہ حیرت اور صدمے کے مارے گنگ سی کھڑی رہ گئی تھی۔ اور دانیال حسن کو خود پہ ترس آرہا تھا۔ "غالباً" وہ دنیا کے پہلے شوہر تھے جو اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کا پرپوزل دے رہے تھے۔

"تمہیں ان چند سالوں میں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میرے ساتھ رہنے میں تمہیں کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ میں نے شروع سے ہی سوچ رکھا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ باندھ کر نہیں رکھوں گا۔ آج تم اس منزل پہ پہنچ گئی ہو کہ اپنے لیے نسبتاً بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔ من پسند راہ چننے کا تمہیں پورا پورا حق ہے۔ اسی لیے۔" وہ پلٹے تھے اور خالی کمرہ دیکھ کر دکھ سے ساکت رہ گئے تھے۔ وہ کب اور کس وقت کمرے سے نکل گئی تھی انہیں کچھ احساس نہ ہو سکا تھا۔ وہ اپنے آپ میں تھے ہی کب کہ گرد و پیش کا کچھ ہوش رہتا۔

"شاید یہ سب کہنے میں میں نے بہت عجلت سے کام لیا ہے۔" وہ گم صم سے ہو کر رہ گئے تھے مگر دل میں ایک گونہ خوشی کا احساس بھی غالب تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ ابھی اپنے کمرے میں داخل ہوئی ہی تھی، جب ملازم نے آکر دانیال حسن کا پیغام دیا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے باتھ روم میں نہانے چلی گئی اب سے کچھ دیر پہلے ہی وہ ہاسپٹل گئی تھی اور ڈاکٹر علی کے اوپر چڑھ دوڑی تھی۔ وہ بے چارہ ہکا بکا سا اس کی لعن طعن سنتا رہا۔ اور جب بہت دیر بعد دل کی بھڑاس نکل گئی تب اسے احساس ہوا کہ وہ اس معصوم انسان سے بہت زیادتی کر بیٹھی ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی اس نے فوراً "سوری" بول دیا تھا۔

"آپ کو پہلے مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ ہو سکتا ہے کہ میں پہلے سے کہیں انگیجڈ ہوں۔" آخر میں اس نے رسان سے کہا تھا۔

"آپ نے تو کبھی اس بارے میں ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی دانیال حسن نے مجھے بتایا۔ اگر وہ بتا دیتے تو میں ایسی جسارت کبھی نہ کرتا۔" ڈاکٹر علی کا اعتراض بجا تھا۔

"ان سے بڑھ کر انجان تو شاید ہی اس دنیا میں کوئی اور ہو گا۔" وہ جل بھن گئی تھی اور علی سے ایک بار پھر اپنی تلخی پر معذرت کرتی ہوئی واپس آگئی تھی۔

وہ نہا کر نکلی تو ملازم ایک بار پھر کمرے میں موجود تھا۔ "آرہی ہوں۔" کہہ کر وہ یونہی کمرے میں ادھر ادھر چکرانے لگی۔ پھر ہمت مجتمع کر کے ان کے کمرے کی طرف چل دی۔

کمرے میں داخل ہوئی تو دانیال حسن کتاب پکڑے بیڈ پر دراز نظر آئے تھے۔ وہ خاموشی سے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو۔۔۔" انہوں نے کتاب سے نظریں اٹھاتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینا چاہا۔ مگر کچھ خاص اندازہ نہ لگا سکے۔ وہ حسب عادت ان سے کافی فاصلے پہ کشن گھسیٹ کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ دانیال حسن چند لمحے یونہی کتاب پر غائب دماغی سے نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ پھر جیسے اس صورت حال سے اکتا کر انہوں نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور بڑے دھیان سے اسے دیکھنے لگے۔

اس نے ہلکے زرد رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ سنہری بال خشک ہو کر پوری پشت پر بکھر گئے تھے اور کتنی ہی ننھی منی گھنگھریالی لٹیں اس کے رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ کھڑکی سے آتی ڈوبتے سورج کی تپش سے عاری نارنجی کرنوں نے اس کے وجود کو سنہرا پن عطا کر دیا تھا، وہ محویت کے عالم میں اسے کسی گہری سوچ میں گم تکتے رہ گئے تھے۔ جب وہ آئی تھی تو ایک نو عمر لاغر و بیزار سی لڑکی کی صورت میں آئی تھی۔ اور آج وہ کس قدر مکمل دکھائی دے رہی تھی۔ ایک پُراعتماد، خوش شکل، باعزت لڑکی، ویسی ہی باہمت،

باحوصلہ اور نڈر جیسی وہ اسے بنانا چاہتے تھے۔
"اور کیا اب میں تمہیں خود سے جدا کر سکوں گا؟" ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔
"کیسا ہو گا وہ لمحہ' وہ ساعت جب تم قطرہ قطرہ زہر میرے وجود میں اتارو گی۔ کیسے لگیں گے تمہارے یہ ہونٹ جب تم دھیرے سے کہہ دو گی۔ "میں جا رہی ہوں۔ تمہیں چھوڑ کر۔" اور کیسی لگیں گی یہ آنکھیں جب ان میں اپنائیت' آشنائی کی چمک کی جگہ لاتعلقی' اجنبیت اور گریز بھر جائے گا اور...
یہ چہرہ کیا تب بھی مجھے اتنا ہی حسین لگے گا جب ایک سفاک سی خود غرضی اس پر آکر ٹھہر جائے گی۔"
وہ اس کے بے حد متناسب نقوش کو کھوج رہے تھے۔
اور ان کی ہر بات سے بے نیاز ور نجف سوچ رہی تھی۔
"کیسا عجیب ہے یہ شخص۔ گھر میں رہنے کو جگہ دے دی۔ دل میں رکھنے کو تیار نہیں' خود ایثار کی مسند پہ چڑھا بیٹھا ہے اور مجھے خود غرضی کی دلدل میں اترنے کی دعوت دے رہا ہے۔ میرا ہاتھ تھام کر ایک ایک قدم چلنا سکھایا۔ اور اب چاہتا ہے' میں اس کے وجود کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جاؤں۔ ذرہ ذرہ سمیٹا ہے اس نے مجھے اور اب ہتھیلی پہ سجائے ہوا کے سامنے کرنا چاہتا ہے۔ چہرے پہ سہرا بنایا۔ کیا کسی دوسرے کے تاج میں سجانے کے لیے۔" اس کا دل بھر آیا تھا۔
"ور نجف!" دانیال حسن نے ایک طویل بے معنی خاموشی سے اکتا کر اسے پکارا تو وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔
"نجف! ہر انسان کو اپنے بارے میں سوچنے کا اختیار حاصل ہے۔" انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر بات کا آغاز کیا۔
"مگر آپ اپنے بارے میں نہیں سوچ رہے" نجف نے ان کا مضطرب چہرہ دیکھا۔
"یہ حق تمہیں بھی حاصل ہے۔"
(بے فکر رہیے' میں اپنا حق پوری طرح استعمال کروں گی۔)
"ہو سکتا ہے ڈاکٹر علی کا فون آج دوبارہ آئے۔" وہ بہت باحوصلہ نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔
(اس کے مزاج تو ٹھیک کر آئی ہوں۔ اب تو آپ کی باری ہے) نجف کو غصے کے ساتھ رونا بھی آ گیا۔
"اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔" (مار دو یا زندہ رکھو)
اور وہ جو ان سے لڑنے مرنے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھی۔ ان سے ایک لفظ بھی نہ کہہ پائی۔ جلد باز آنسو بلا اجازت ہی پلکوں کی باڑھ توڑے رخساروں پہ چلے آئے تھے۔
"نجف۔ کیا سوچ رہی ہو تم؟" وہ ان گھڑیوں کی طوالت سے گھبرا گئے تھے۔ جواباً اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ دکھ' ناراضی' شکایت' احتجاج' آنسوؤں سے لبریز آنکھوں نے انہیں بری طرح شرمندہ کر دیا تھا۔
"کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے' خود غرض' بے حس' گھٹیا' ایک ایسی راہ چلتی لڑکی' جو اپنی منزل کے حاصل ہونے تک آپ کے در پر پڑی رہی اور اب آپ کو ٹھوکر لگا کر چل دے گی۔ اتنے سالوں میں بس اتنا ہی جان پائے ہیں آپ مجھے' کسی بچے کی طرح پرورش کی ہے آپ نے میری' پھر بھی اتنی بدگمانی' اتنی بے اعتباری۔"
دانیال حسن اپنی جگہ سن سے ہو کر بیٹھے رہے۔ اور وہ بولتی رہی۔ بہت دیر بعد جب دل کا سارا غبار نکل گیا تب وہ خاموش ہوئی' آنسو آنکھوں سے ابھی بھی رواں تھے۔
دانیال حسن کتنی ہی دیر تک بے یقینی سے اسے دیکھتے رہے۔ کیا یہ وہی ور نجف تھی جو ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھی رہتی تھی اور آج وہ ان سے ان ہی کے لیے لڑ رہی تھی۔ سب کچھ کہنے کے بعد وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے' سسکیاں بھرتے ہوئے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہی اس کا مخصوص انداز۔
ان کے لبوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ ابھری تھی۔
"نجف! ادھر آؤ۔" ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سرشاری تھی۔ وہ بغیر ہلے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

"کیا تم مجھے یہ احساس دلانا چاہتی ہو کہ میں خود اٹھ کر تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔" نجف نے خفگی سے انہیں دیکھا اور پھر اٹھ کر ان کے پاس چلی آئی۔
"یہاں بیٹھو۔" وہ چپ چاپ بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔
"جانتی ہو نجف۔ اگر تم مجھے چھوڑ کر چلی جاتیں تو میں مر جاتا۔" ان کے لہجے کی گہرائی و سنجیدگی پر نجف نے دہل کر انہیں دیکھا تھا۔
"آئندہ آپ نے ایسی بات کہی تو۔" وہ غصے کے مارے کچھ کہہ نہ پائی۔
"تو؟"
"تو میں خود بھی مر جاؤں گی۔" وہ ان کے کندھے پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔
اور دانیال حسن کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کا لمحہ اور کوئی نہیں تھا۔
"تمہیں مرنے کون دے گا پگلی؟" اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے انہوں نے زیر لب کہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

ڈھائی گھنٹے کی مسافت کے بعد جب گاڑی شہر کے ناہموار راستوں پر سفر کرنے لگی تو سورج ڈوب چکا تھا' سرمئی آسمان کے کنارے سیاہ پڑ چکے تھے اور کار کی کھڑکی سے نظر آتے آسمان پر ایک کرلاتی کونج کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا' یہاں کی مانوس فضاؤں میں ایک گمنام سی اداسی رچی ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ جن حالات میں وہ یہ شہر چھوڑ گئی تھی۔ اور اب کس حیثیت سے واپس آ رہی تھی۔
"لیکن ہر کسی کے ایسے نصیب کہاں؟ کئی ستارے آسمان سے ٹوٹ کر بستی کے اندھیروں میں جا گرتے ہیں۔ مجھے تو دانیال حسن مل گئے تھے۔ اور ضروری تو نہیں کہ ہر ور نجف کو ایک دانیال حسن مل جائے۔" کھڑکی سے باہر نظریں جمائے سوچ رہی تھی تب ہی ڈرائیور نے اسے چونکا دیا۔ وہ راستے کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ ور نجف نے تفصیل سے اسے بتایا اور پھر غور سے ان جانے پہچانے راستوں کو دیکھنے لگی۔ ہر موڑ پر وہ پہلے سے جان جاتی تھی کہ اب یہاں کیا ہو گا۔
"اور اب یہاں سے موڑ کاٹ کر ہم بڑی سڑک پر رک جائیں گے' جہاں بابا تاج نوٹ کی ریڑھی لگائے کھڑا ہو گا اور اس کے نزدیک شیشم کے درخت تلے پرانی جوتیاں مرمت کرتا ہوا فضلو موچی' جو انہیں بستے اٹھائے دیکھتا اور فوراً گنگنا دیتا۔
"پہلے کتاب میں پڑھوں گا۔" چند بھولی بسری یادیں اس کی ہونٹوں پہ پھیکی مسکراہٹ آکر ٹھہر گئی۔
"گلی تنگ ہے۔ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔" ڈرائیور نے بتایا تو وہ گلی کے سرے پر ہی اتر آئی گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے نجانے کیوں اسے اپنے ہاتھ کانپتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ وہ ڈرائیور کو وہیں رکنے کی ہدایت دیتے ہوئے خود آگے بڑھ گئی تھی۔
آتے جاتے کئی راہگیروں نے اسے بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ بائیں طرف ایک مزید تنگ گلی کی طرف موڑ کاٹتے ہوئے اسے اپنے بے تحاشا دھڑکتے دل پہ قابو پانے میں بہت مشکل پیش آئی تھی۔
شام کے اندھیرے میں اس گلی کی تاریکی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ وہ کئی بار گرتے گرتے بچی معلوم نہیں راستہ خراب تھا یا خود اس کے ہاتھ پاؤں بے قابو ہو رہے تھے۔ اور ذرا آگے جا کر گنتے ہی جانے پہچانے گھر دکھائی دینے لگے تھے۔ یہ باجی متو کا گھر جو اس وقت دروازے میں کھڑی ہو کر حلق پھاڑ پھاڑ کر اپنے بچوں کو گھر کے اندر بلا لیا کرتی تھی۔ اس سے آگے وہ گھر۔ اور ایک گھر۔ بوسیدہ سی تین چار سیڑھیوں والا' جس کے سال خوردہ لکڑی کے دروازے کا نیلا رنگ برسوں پہلے مٹیالا ہو گیا تھا۔ اور جس کے دروازے پر پردے کے نام پر ایک میلی سی مختصر سی چادر ہمہ وقت جھولتی رہتی تھی۔
"اف۔" ہلکی سی ٹھوکر لگی تھی۔ اس نے سنبھل کر سر اٹھایا۔ تین چار سیڑھیاں اس کے سامنے تھیں۔ سیڑھیوں کی اینٹوں پر سے سیمنٹ اترا ہوا ہے۔ دوسری سیڑھی کے سرے کی اینٹ ہمیشہ گرنے کے لیے بے تاب رہتی تھی۔ اسے ابھی تک یاد تھا سو

پاؤں بہت سنبھل کر رکھا۔ دروازے کے عین سامنے پہنچ کر دل پوری قوت سے سکڑ کر پھیلا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"کیا ہو گا اس بند دروازے کے پیچھے۔" ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا تھا پلٹ کر بھاگتی چلی جائے اور دوبارہ کبھی اس طرف کا رخ نہ کرے۔ مگر کسی نادیدہ قوت نے اس کا ہاتھ اٹھا کر دروازے پر رکھ دیا تھا جو ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا تھا۔ اس نے آنکھیں ایک لمحے کے لیے بند کر لیں۔

"دروازے کے عین سامنے دادی کی چارپائی ہو گی۔ اور دادی حسب عادت کھانا منگوانے کے لیے چیخ رہی ہوں گی۔ لبنیٰ کچن میں بری طرح مصروف ہو گی۔ ابا چارپائی پہ نیم دراز خلال کرتے ہوئے۔ عظیم اوپر چھت پہ۔ صدف کمرے میں کوئی پرانا رسالہ پڑھتے ہوئے اور اماں ادھر ادھر پورے صحن میں چکراتی پھر رہی ہوں گی۔" بس ایک لمحہ لگا تھا اور سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا اس نے اٹھا ہوا قدم دہلیز پر رکھا اور دروازہ پوری طرح کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

"یہ کیا۔۔؟" وہ اپنی جگہ پتھر ہو گئی تھی۔

"کیا میں راستہ بھول گئی ہوں۔" وہ عالم بے یقینی میں تھی۔ کچھ بھی تو ویسا نہیں تھا جیسا ابھی اور اسی لمحے وہ سوچ رہی تھی۔ وہ تو ایک قبرستان میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک اجڑے ہوئے، ویران اور بے آباد مکان میں۔ گھر تو کہیں تھا ہی نہیں۔

اڑ چکے پنچھی کسی اور آشیاں کی طرف
نیم کے پیڑ پہ ٹوٹے ہوئے پر باقی ہیں

ہر ایک چیز جیسے تاریکی کی زد میں تھی۔ سناٹا جیسے وحشت زدہ ہو کر چلا رہا تھا۔ چھت، دیواریں، برآمدے، کمرے، سب ہی کچھ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہاں صحن کے ایک کونے میں ایک بوڑھا وجود دم سادھے بیٹھا تھا، اس کے پاس چولہے میں سرخ دہکتے کوئلوں پہ سفید سی راکھ جم چکی تھی۔ لکڑیاں سلگ رہی تھیں مگر ان میں سے اٹھتا دھواں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور اس بوڑھے وجود کے پاس روٹیوں بھری چنگیر رکھی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس بت بنے وجود میں حرکت ہوئی تھی۔

اس نے چولہے پر رکھی سیاہ ہنڈیا کا ڈھکن اٹھا کر لکڑی کی ڈوئی خواہ مخواہ ہی اس میں گھمائی تھی۔ اور پھر اس پہ ڈھکن رکھ کر ڈوئی رکھ دی تھی۔ ڈوئی سے سالن کا ہی قطرہ قطرہ تن کر راکھ پر گرنے لگا تھا تب ہی صحن کے بیچوں بیچ پڑی چارپائی چرچرائی تھی۔ اس پہ ایک نحیف و نزار وجود ہولے سے کھانسا تھا۔ اور کھانستا ہی چلا گیا تھا۔

"ابا۔۔" اسے پہچاننے میں وقت نہیں لگا تھا۔ کھانستا ہوا وجود ایک دم منجمد ہو گیا تھا۔

"اماں۔۔!" اس کے لبوں سے سسکی نکلی تھی۔

"کون ہے۔۔؟" بوڑھی آنکھیں اندھیرا ٹٹولنے لگیں۔

"میں۔۔۔ در نجف۔۔" وہ ان کی طرف بھاگی تھی۔

"نجف۔۔ نجف۔۔ تو آ گئی، میری نجف۔۔"

اماں نے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو دی تھیں۔ خود اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اور ابا چارپائی پہ بیٹھ کر خود کو کوس رہے تھے۔

"کاش۔۔ کوئی مجھے ایک بار وہ وقت لوٹا دے۔" ان کی زبان پہ ایک ہی التجا تھی۔

مگر وقت کب کسی کے ہاتھ آیا ہے۔ وہ دونوں گزرے وقت کو رو رہے تھے۔ ابا مرنے والوں کے لیے بین کرتے رہے۔ اماں بچھڑنے والوں کے لیے نوحے کرتی رہیں۔ اور وہ ششدر سی سنتی رہی۔

"اور عظیم شراب کے نشے میں دھت اپنے ہی ایک دوست کو قتل کر کے جیل جا پہنچا۔"

"کسے الزام دوں میں۔۔ قسمت کو۔۔ آپ دونوں کو۔۔؟ یا عظیم کو۔۔؟"

وہ ساری رات کسی بے قرار روح کی طرح پورے گھر میں چکراتی رہی۔ آنسو کہاں تھے آنکھوں میں،

یہاں تو بس یادیں تھیں۔ کچھ بچھڑی ہوئی ساعتیں۔ ہر شے نے بہت کچھ یاد دلایا تھا۔ یہ پلنگ بڑی آپا کا تھا وہ ہمیشہ اسی پہ بیٹھ کر کڑھائی کیا کرتی تھیں۔ اس صندوق میں ممی سے چھپایا کرتی تھی۔ یہ بیری بینا آپی نے خود لگائی تھی۔ اور برآمدے کے اس کونے میں بیٹھ کر اماں نے میری گڑیا کی فراک پر ستارے ٹانکے تھے۔ یہ کھونٹی سے لٹکی ہوئی چیختے چنگھاڑتے رنگوں والی شرٹس۔۔ جن کے کالروں اور کفوں پر میل جوں کی توں موجود ہے۔ یوں جیسے عظیم ابھی ابھی اتار کر گیا ہو۔ اور یہ الماری کے آخری خانے میں پڑے رسالے صدف کے تھے جنہیں پڑھ کر وہ سوتی تھی تو مسکراہٹ رات بھر اس کے ہونٹوں سے جدا نہ ہوتی تھی۔ وہ رات نہیں قیامت تھی۔

"میں ان سب سے ملوں گی اماں!" وہ اپنے زخم زخم دل کے ساتھ نڈھال تھی۔

"مل لینا۔۔ سب سے مل لینا۔۔ مگر لبنیٰ سے کہاں ملو گی۔۔؟ وہ تمہیں کیسے ملے گی؟" اماں کی آنکھوں کا سیلاب رکنے میں نہ آیا تھا۔ اور نجف اس رات کو چیخ چیخ کر روئی تھی۔

"اگر تم جاگ رہی تھیں تو تم نے مجھے روکا کیوں نہیں۔ آخری گھڑیوں میں تمہارے پاس تو ہوتی۔ جی بھر کے دیکھ تو لیتی۔ اور کیا معلوم میں تمہیں روک ہی لیتی۔ ایسا کچھ بھی نہ کرنے دیتی۔ اور اگر تمہاری ایسی کوئی خواہش تھی تو اس رات ایک بار اٹھ کر مجھے اپنے گلے سے کیوں نہ لگا لیا۔"

"اور اب ہم کس کس دکھ کو ساتھ لے کر جئیں گے اماں! کس کس یاد کو روئیں گے؟" اس کا دماغ ماؤف سا ہو گیا تھا۔

اور اگلی صبح اس نے اس گھر کی ایک ایک چیز کو اپنے ہاتھوں سے چھوا تھا، پلکوں سے چوما تھا، اپنے والوں کی یاد کو سمیٹ کر دل میں رکھا تھا اور باہر نکل گئی تھی۔ لرزتے کانپتے ہاتھوں سے دروازے پر تالا لگا کر اس نے چابی دیوار کے رستے صحن میں پھینک دی تھی۔ اور پھر سیڑھیاں اتر کر گلی میں آ گئی تھی۔ اماں، ابا اس سے کچھ آگے سر جھکائے چل رہے تھے۔

وہ بھی چپ چاپ ان کے پیچھے تھی۔ گلی کے آخری سرے پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا وہ خود وہاں سے آ گئی تھی، مگر ننھی منی در نجف بوسیدہ سیڑھیوں پر بیٹھی حسرت بھری نگاہوں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"نجانے کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں اماں، ابا کے سامنے جا کھڑی ہوں۔ گزشتہ ماہ و سال کی ایک ایک ساعت سے وقت کی گرد جھاڑ کر ان کے سامنے رکھوں اور پوچھوں۔

"ذرا بتائیے تو بیٹے کو بیٹیوں پر فوقیت دینے سے حاصل وصول کیا ہوا؟

ماں باپ تو اولاد میں فرق نہیں رکھتے پھر آپ نے بیٹیوں کو دھتکار کر بیٹے کو سینے سے کیوں لگایا۔؟ آخر وہ کیا تھا ایسا جو آپ کو عظیم سے مل سکتا تھا، ہم سے نہیں؟

ہمارے جسم میں بھی عظیم کی طرح آپ ہی کا خون دوڑ رہا تھا۔ عظیم کی طرح ہم نے بھی آپ ہی کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ پھر۔۔ پھر ہم اتنے کمتر کیوں ہو گئے؟

آپ نے اپنی اولاد کو بھی مفادات کے ترازو میں تولا اور جو پلڑا بھاری نکلا، اسی پر اپنے پیار محبت، اور چاہت کی مہر ثبت کر دی۔ چھ انسانی جانیں ایک انسان کے برابر۔ کیا اتنی ارزاں بھی ہو سکتی ہیں۔

کبھی احساس ہوا تھا، آپ لوگوں کو کہ ہمیں کیا چاہیے تھا اور کیا نہیں۔۔؟ ہم اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کو ترستے رہے اور آپ اپنے بیٹے کی عیاشیوں کا سامان کرتے رہے۔

ہمارے لیے آپ کے پاس دودھ نہیں تھا، پھل نہیں تھے، فیس کے پیسے نہیں تھے، تحفظ نہیں تھا، پیار، محبت، شفقت، خوشیاں سب کچھ تھا آپ کے پاس لیکن ہمارے لیے نہیں صرف عظیم کے لیے آپ جانتے ہیں "آپ نے بڑی آپا کے ساتھ کیا کیا تھا؟ میں آج بھی اپنے ہاتھ کی پشت پر ان کے آنسوؤں کی جلن محسوس کرتی ہوں، آپ کیسے ماں باپ تھے کہ

ان کے غم کی آنچ آپ کے دلوں کو چھو بھی نہ سکی۔ آج آپا اس گھر میں ایک ملازمہ سے بھی بدتر زندگی گزار رہی ہیں کیونکہ ان کے شوہر کی پہلی بیوی ٹھیک ہو چکی ہے۔ میں رات کو سوتی ہوں تو آج بھی میرا تکیہ ان کے غم میں بھیگتا رہتا ہے۔

اور عینا آپی۔ ان کے ساتھ کیا کیا تھا آپ نے۔ ایک دوزخ میں دھکیلا تھا آپ نے انہیں اور اب وہ چاہیں بھی تو اس دوزخ سے رہائی نہیں پا سکتیں کہ ان کا بوڑھا شوہر چار بچوں کی زنجیر ان کے پیروں میں باندھ کر خود مر چکا ہے۔

اور نینا آپی۔ جو دل میں بھی خواب دیکھا کرتی تھیں خوشیوں کے "آزادی" کے خوبصورت خواب۔ وہ اس دنیا سے ہی رخصت ہو گئیں کہ وہ بڑی آپا اور عینا کی طرح گھٹ گھٹ کر جینے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھیں۔

اور صبیحہ جسے محض پانچ چھ سال کی عمر میں آپ نے خود سے جدا کر دیا تھا صرف اس لیے کہ وہ آپ کے لیے بیکار تھی۔ کبھی سوچا آپ نے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہوگا۔ وہ زندہ بھی ہے کہ مر گئی۔ کسی کی عیاشیوں کی بھینٹ چڑھ گئی یا کسی سڑک کنارے بھیک مانگ رہی ہوگی۔

"اور میں۔ در نجف۔ جس نے جذبات میں آ کر ایک انتہائی قدم اٹھا لیا۔ گھر سے بھاگ آئی۔ تمام عمر کے لیے اپنے وجود پر "بھاگی ہوئی لڑکی" کا لیبل لگوا لیا۔ اگر اس جذباتی غلطی میں میری قسمت مجھے دھوکا دے جاتی تو۔

اور اگر میں اس رکشہ ڈرائیور کے ہتھے چڑھ گئی ہوتی اگر مجھے دانیال حسن نہ ملتے تو۔؟ اگر میں کسی ایسی جگہ پہنچ جاتی جہاں عصمت فروشی کا دھندا ہو رہا ہوتا تو۔؟

تو آج میں اس مقام پر نہ ہوتی۔ میں کسی کوٹھے پر پیروں میں گھنگھرو باندھے ناچ رہی ہوتی۔ جسم فروشی کر رہی ہوتی یا اپنے اس وجود سے انتقام لے رہی ہوتی جس کی بنا پر میں اپنے ماں باپ کی نفرت کا شکار ہوئی۔

اور آپ کو کیا معلوم آپ نے ہمارا کتنا نقصان کیا ہے۔ کیا کیا چھینا ہے ہم سے۔ میں یہ سب پوچھنا چاہتی ہوں ان دو انسانوں سے جنہوں نے ہمیں جنم دیا اور جنم دے کر بھول گئے۔ وہ جو میرے ماں باپ ہیں۔

لیکن میں یہ نہیں پوچھ پاتی جب میں ان کی آنکھوں میں اشک ندامت دیکھتی ہوں جب میرا سامنا کرتے ہی ان کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ اور جب میں انہیں خدا کے حضور توبہ کی معافی کی فریاد کرتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ تب یہ سوال میرے اندر دفن ہو جاتے ہیں۔ میری زبان منجمد ہو جاتی ہے اور میں نئے سرے سے ان کے سب گناہ معاف کر دینے پر تیار ہو جاتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ اب تو تلافی کی کوئی صورت بھی باقی نہیں رہی کہ وقت بہت بیت گیا ہے۔

ان کی ذرا سی توجہ معمولی سی چاہت کو ترسنے والی در نجف آج خود دو سروں کو زندگی دینے کا وسیلہ بن گئی ہے۔

میں ہاسپٹل کے کوریڈور سے گزر رہی ہوں تو لوگ حسرت کی نگاہ سے مجھے دیکھتے ہیں۔ میری ذرا سی توجہ حاصل کرنے کے لیے میرے سامنے بچھے جاتے ہیں۔ مجھے دعائیں دیتے ہوئے ان کی زبانیں نہیں تھکتیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں ہی ہوں وہ ڈاکٹر در نجف جس کے ہاتھ میں خدا نے بہت شفا رکھی ہے۔ جو ایک بار اپنے مریض کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دے تو اس کی آدھی تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ لیکن ان ہی لوگوں کو جب میں ڈلیوری روم سے نکل کر بشارت دیتی ہوں کہ خدا نے تمہیں بیٹی جیسی رحمت سے نوازا ہے تو وہ بے یقین سے ہو کر مجھے دیکھتے ہیں۔ ان کے چہرے اتر جاتے ہیں کندھے جھک جاتے ہیں اور چال میں سستی آ جاتی ہے۔ تب میں انہیں نئے سرے سے سمجھانے لگتی ہوں کہ۔

"دیکھو! بیٹیاں تتلیوں کی مانند ہوتی ہیں۔ انہیں بے دردی سے ہاتھ میں دبوچ لوگے تو یہ مرجھا جائیں گی تمہارے امتیازی رویوں کے سامنے ان کی چمک ماند پڑ جائے گی۔ ان کی ذات کے آئینے دھندلا جائیں گے۔

خدارا ان تتلیوں کا خیال رکھنا انہیں نفرت کی دھوپ سے بچانا اپنے سائے کی پناہ میں رکھنا کہ ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ وقت بیت جائے تو حاصل وصول کچھ نہیں ہوتا۔ حساب کتاب کرنے بیٹھو تو کاسیاہیوں پر زیاں کا احساس حاوی ہونے لگتا ہے۔ مجھے دیکھو۔ آج میرے پاس بہت کچھ ہے مگر پھر بھی جو کچھ کھویا ہے وہ پانے سے کہیں زیادہ ہے۔

دانیال حسن آج بھی مجھ پہ جان چھڑکتے ہیں۔ میرے عزت و احترام میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ لیکن میں ان کی یہ سب محبتیں حق سمجھ کر نہیں احسان سمجھ کر وصول کرتی ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ہمارا معاشرہ "بھاگی ہوئی لڑکی" کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ اگرچہ دانیال حسن کی طرف سے کبھی اس بات کا اظہار نہیں ہوا مگر پھر بھی احساس ہمیشہ مجھے چوکے لگا رہے کہ میں باعزت طریقے سے ان کی زندگی میں داخل نہیں ہوئی۔

اور یہ خوف کہ اگر جو کبھی میرے بچوں کو میرے ماضی کی خبر ہو گئی تو کیا میں ان کے سامنے سر اٹھا کر کھڑی ہو سکوں گی۔

"الوینہ! کہاں جا رہی ہو تم؟" سخت کھردرا لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تو وہ بری طرح چونک گئی۔ آواز بلاشبہ وجاہت دانیال کی تھی۔ اس کا بڑا بیٹا جو بی اے کا اسٹوڈنٹ تھا۔

"یہ کس لہجے میں بات کر رہا ہے؟" در نجف کا دل گہرائی میں ڈوب کر ابھرا تھا۔ ماضی کا ایک بے رحم لمحہ اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا۔

"کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرانے جا رہی ہے۔" وہ فکر مندی ہو کر پین یوں ہی ڈائری میں رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"دوست کے گھر جا رہی ہوں۔" الوینہ نے بھائی کے غیر معمولی انداز پر بہت حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"کیسے جاؤ گی۔؟" لہجہ سخت ہونے کے ساتھ ساتھ تفتیشی بھی تھا۔

"گاڑی خراب ہے ظاہر ہے رکشہ یا ٹیکسی سے جاؤں گی۔ مگر بھائی! آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" وہ ہنوز حیران و پریشان تھی۔

"اس لیے بہنا کہ جب میں موجود ہوں تو تمہیں رکشہ ٹیکسی میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ چلو میں تمہیں بائیک پہ چھوڑ آتا ہوں۔" لہجہ ہی نہیں انداز بھی بدل گیا تھا۔ دروازے کا پٹ تھامے کھڑی در نجف نے سکون کا سانس لیا تھا۔

"سچ بھائی! راستے میں آئس کریم بھی کھائیں گے۔" ایف۔ ایس سی کی اسٹوڈنٹ الوینہ چہکتی بھائی کے مضبوط کندھے سے لگی جا رہی تھی۔

"بس ایک یہی تو چاہا تھا ہم نے۔" نجف دونوں کو باہر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی تب ہی دانیال وہیل چیئر دھکیلتے اس کی طرف بڑھ آئے۔ اب سے کچھ دیر قبل اس کے چہرے پہ لکھی تمام تحریریں وہ پڑھ چکے تھے۔

"ہم نے بچوں کی تربیت میں کہیں کوئی کمی تو نہیں چھوڑی پھر تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اس گھر میں ایک دوسرا عظیم یا ایک دوسری نجف پیدا ہو سکتی ہے۔" وہ پوچھ رہے تھے۔ در نجف نے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا۔ دوبارہ اپنے کمرے کی طرف پلٹتے ہوئے اس نے دانیال کے عقب میں صوفے پر بیٹھے اماں ابا کو واضح طور پر طویل سانس لے کر سر جھکاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور پھر کمرے میں آ کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"اور مجھے سب کچھ بھول جاتا ہے۔ ماضی میں جو کچھ بھی ہوا اچھا یا برا۔ جب میں دیکھتی ہوں اپنے ہنستے کھلکھلاتے بچوں کو۔ اپنے جانثار شوہر کو۔ اپنے پھولوں سے مہکتے گھر کو اپنی کامیاب زندگی کو۔ اس بلند مقام کو جو خدا کے بعد صرف دانیال حسن کی دین ہے۔ اور مجھے یاد رہتا ہے اپنے رب کے سامنے جھک جانا۔ سجدہ شکر بجا لانا کہ جس نے مجھے عزت سے نوازا اور آسمان کے اوج پہ چمکتا ہوا چاند بنا دیا۔"

اس کا دل احساس شکر سے لبریز ہو رہا تھا سو وہ فوراً ہی قلم اور ڈائری بند کر کے شکرانے کے نفل پڑھنے کو اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

★